دہشت گردی کے خلاف جنگ
پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات

جلد دوم

پروفیسر خورشید احمد

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

© IPS Press 2021

دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات (جلد دوم)

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: محمود فاروقی، سلمان طاہر

ISBN: 978-969-448-797-7

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹور تیج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

۳۲۷٫۵۴۹۰۷۳ دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات، جلد دوم
خ ور خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۱ء
۲۲۸ صفحات مع اشاریہ
۱۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور پاکستان ۲۔ پاکستان-خارجہ تعلقات-امریکہ
۳۔ پاکستان-دہشت گردی کے خلاف جنگ-واقعات ۴۔ پاکستان-تاریخ ۲۰۰۲ء

PRESS

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۱ فیکس: ۰۵۱-۸۴۳۸۳۹۰
ای میل: publications@ips.net.pk
ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk
فیس بک: IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری
الفاظ و صفحہ سازی: طاہر احمد عباسی، محمد عالم
طباعت: اے-ایس پرنٹرز، راولپنڈی

فہرست

- پیش لفظ V
- تعارف VII

دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعلقات اور اس کے اثرات - جلد دوم

داخلی سلامتی اور امن وامان کے مسائل

- پاکستانی سرحدوں کے اندر امریکی کارروائیاں ۰۳
- ایبٹ آباد آپریشن ۲۰۱۱ ..... ۲۵
- امریکہ کے ساتھ تعاون: امن وامان کی صورت حال پر اثرات-۱، ۲ ..... ۳۵
- صدر پر حملہ اور ان کے سیکورٹی انتظامات ۶۱
- لال مسجد پر یورش اور جامعہ حفصہ کا بحران ۶۹
- سوات آپریشن اور اندرون ملک بے گھر افراد کا مسئلہ ۹۱
- عافیہ صدیقی کی گرفتاری اور سزا ۱۰۳
- بے نظیر بھٹو اور دیگر قائدین پر حملے ۱۰۷
- سانحہ راولپنڈی: فرقہ واریت کی جنگ کی طرف دھکیلنے کی کوشش ۱۱۵
- بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں دہشت گردی اور قوت کا استعمال ۱۲۷
- کوئٹہ میں عاشورہ کے موقع پر دہشت گردوں کا حملہ ۱۳۷
- منی لانڈرنگ اور دہشت گردی کی روک تھام کے لیے قانون سازی ۱۴۱
- امریکی ڈرون حملے اور سپلائی لائن کی بندش ۱۶۳
- زمینی حقائق کے ادراک کی ضرورت ۱۸۵
- ضمیمہ: 'دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعلقات اور اس کے اثرات'
  جلد اول کی فہرست عنوانات ۲۰۳
- اشاریہ ۲۰۵

*مضامین از عالمی ترجمان القرآن

پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کرکے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشوونما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے، یہ سلسلہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن وسنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آگیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیِ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہوگیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لاڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن وسنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جا سکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورت حال کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کر سکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرز حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، اور معاشی صورت حال اور امکانات جیسے موضوعات پر سات کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ کچھ دنوں میں تین اور کتب بھی مکمل ہونے کو ہیں، ان شاء اللہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کر لے۔

لیسٹر، برطانیہ — پروفیسر خورشید احمد

۲۸ مئی ۲۰۲۱ء

تعارف

۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے ردِ عمل میں امریکی حکومت نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کیاتو پاکستان میں اس وقت جنرل پرویز مشرف کی حکومت تھی۔ جنرل مشرف نے امریکہ کی زیر قیادت اس جنگ میں تعاون کا اعلان کیا۔ بعد میں آنے والی رپورٹس سے یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ جنگ میں تعاون کے لئے شرائط کار اور ان پر عملدرآمد کے حوالہ سے اس نہایت اہم پالیسی فیصلے میں جنرل پرویز مشرف نے فوری طور پر کسی بھی دوسرے فرد یا ادارے کو اعتماد میں لینے اور اس سے مشاورت کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ نتیجتاً خارجہ پالیسی کی سطح پر بھی اور عملدرآمد کے لیے طریقہ کار کے بارے میں بھی فیصلہ کے وقت ابہام موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ۲۰ سال گزرنے کے باوجود اس ضمن میں بہت سے سوالات ابھی تک جواب طلب ہیں۔

خارجہ، دفاع اور سلامتی کے میدان ایسے ہیں جہاں بعض اوقات پالیسیوں میں ابہام حکمت عملی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سوچ سمجھ کر رکھا جانے والا یہ ابہام اقدامات کے ایک مربوط سلسلہ سے جڑا ہوتا ہے۔ تاہم اگر یہ ابہام کسی قومی مفاد میں نہیں بلکہ کسی فرد کی ذاتی مجبوریوں کی بنیاد پر ہو، مشاورت کے بغیر ہو اور شفافیت کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے لیے رکھا جائے تو یہ ایک جانب داخلی سطح پر عدم اعتماد کا ماحول پیدا کرتا ہے اور یوں پالیسیوں کی درست تشکیل اور ان پر مؤثر عملدرآمد ناممکن ہو جاتا ہے، دوسری جانب یہ صورتحال فریق ثانی کو، بالخصوص جبکہ طاقت اور وسائل کا عمومی توازن بھی اس کے حق میں ہو، موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ شرائط کار میں ابہام کا اپنے حق میں فائدہ اٹھائے۔ یوں دوطرفہ تعاون کی سپرٹ عملاً یک طرفہ معاونت میں بدل جاتی ہے۔ اس سارے عمل میں طاقتور فریق کا دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے اور پہلے سے کمزور دوسرے فریق کی پوزیشن کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں پاکستان کی شراکت کی عملی صورت یہی رہی۔ اسی لیے اس جنگ کے دوران خارجہ پالیسی کی تشکیل ہو اور یا اس پر عملدرآمد، پاکستانی حکومت شدید دباؤ کا شکار رہی۔ دوسری جانب امریکی حکومت نے ان سفارتی آداب کا بھی خیال نہیں رکھا جن کا عام دوطرفہ تعلقات کے دوران بھی اہتمام ضروری ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دوران سفارتی آداب ہی نہیں بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی بھی امریکہ کی جانب سے مسلسل کی جاتی رہی۔ فطری طور پر اس صورت حال نے پاکستان کی اندرونی حالات کے بارے میں عالمی رائے عامہ اور بین الاقوامی امیج پر بھی نہایت منفی اثرات ڈالے۔ فطری طور پر حکومت کی قوت کار پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہوئے جن کی قیمت آج تک قوم کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔

اس دوران ۲۰۰۲ میں ملک میں عام انتخابات کے نتیجہ میں پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آنا بہر حال ایک خوش آئند پیش رفت تھی۔ حکمرانی تو عملاً اس وقت بھی شخصی ہی تھی کہ جنرل پرویز مشرف فوج کے سربراہ اور صدر ہونے کی بناء پر اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہوئے تمام کلیدی فیصلوں پر اثرانداز ہونا چاہتے تھے۔ تاہم انتخاب کے بعد پارلیمنٹ کی صورت میں کم از کم ایک ایسا پلیٹ فارم وجود میں آگیا جہاں قومی اور حکومتی پالیسیوں پر غور و فکر، بحث اور ایک متبادل نقطۂ نظر پیش کرنے کے مواقع موجود تھے۔

پروفیسر خورشید احمد پاکستانی پارلیمنٹ کے ایوان بالا کے چار مرتبہ رکن منتخب ہوئے۔ ہر دور میں ایوان کی کارروائیاں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ اس ایوان کے ان ارکان میں شامل ہیں جنہوں نے قومی مسائل پر بحث و مباحثہ میں اپنے کردار سے اس ایوان کے وقار کو بلند کیا۔ سیاسی اور گروہی مفاد کو نظر انداز کر کے قومی اور ملی نقطۂ نظر کی بنیاد پر اور سطحی اور وقتی پہلو سے آگے بڑھ کر وسیع تر تناظر میں مسائل کو سمجھنا اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے لائحہ عمل کے لیے تجاویز دینا ان کا طرہ امتیاز ہے جو سینیٹ میں ان کی ہر تقریر اور گفتگو میں جھلکتا ہے۔

دو جلدوں پر مبنی زیر نظر کتاب پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں پروفیسر خورشید احمد کی ان تقاریر کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہے جو دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں تعاون کے ضمن میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل، اس کی مختلف جہات، نوعیت اور اس بارے میں کیے جانے والے فیصلوں کے اثرات سے بحث کرتی ہیں۔ موضوعات کی مناسبت سے انہیں دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جلد اول کا پہلا حصہ خارجہ پالیسی کی تشکیل کے تقاضوں کی نشان دہی کے بعد دہشتگردی کے خلاف جنگ میں تعاون کے دوران مختلف مراحل اور پیش آنے والے مختلف واقعات پر عمل درآمد اور پاکستان کے لیے ان کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔ اس حصہ کا پہلا جزو پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوطرفہ معاملات سے متعلق ہے۔ جبکہ دوسرا جزو ان عالمی حالات و واقعات سے متعلق ہے جن پر پاکستان امریکی دباؤ کی بناء پر اپنے مفاد میں اور انصاف کی بنیاد پر اقدام کرنے سے معذور رہا یا گریز کرتا رہا۔

دوسری جلد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون کے ان اثرات سے بحث کرتی ہے جو براہ راست پاکستان اور پاکستانیوں کے حالات پر اثرانداز ہوئے۔ ان اثرات کا دائرہ یوں تو زندگی کے ہر شعبے تک پھیلا ہوا ہے لیکن کتاب کے اس حصہ میں یہ ان امور سے بحث کرتی ہے جو داخلی سلامتی اور امن وامان سے متعلق ہیں۔

پارلیمنٹ میں بحث کے دوران کی گئی تقاریر کی اہمیت پاکستان کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر پیش آنے والے واقعات اوران کے پس منظر و پیش منظر کو سمجھنے کے علاوہ خود پارلیمنٹ کے کردار، اس کی کارکردگی اور یہاں بحث کے طریقہ کار کو سمجھنے کے لیے بے حد مفید ہے۔ دوسری جانب اس مرتب شکل میں یہ مستقل راہنمائی فراہم کرتی ہیں کہ دوطرفہ اور کثیر جہتی تعلقات کے لیے خارجہ پالیسی اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پالیسی کو کس طرح دیگر پالیسیوں سے مربوط ہونا چاہیے اور اس پر عملدرآمد کے لیے مختلف اداروں کو کس طرح کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ سب کچھ درست بنیادوں پر اور مؤثر انداز سے نہ ہو تو نتائج

کس قدر بھیانک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

امریکہ دنیا کے اہم ترین ملکوں میں سے ہے۔ چنانچہ تمام تر اتار چڑھاؤ کے باوجود پاکستان میں پالیسی سازوں نے امریکہ کے ساتھ ہمیشہ ہی نباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جواباً پاکستان نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے اس کا کچھ اندازہ اس کتاب میں شامل مضامین سے بھی ہو جاتا ہے۔ آنے والے دنوں میں پاکستان کے لیے امریکہ کے ساتھ تعلقات کی کیا حکمت عملی ہو کہ وہ طاقتور فریق کے لیے یکطرفہ مفادات کی بجائے حقیقی دوطرفہ مفادات پر منتج ہو سکے۔ یہ وہ سوال ہے جو پاکستانی پالیسی سازوں کو آج بھی درپیش ہے اور آئندہ بھی درپیش رہے گا۔

اس مجموعی تناظر میں یہ کتاب پاکستان کی سیاست، بین الاقوامی تعلقات اور دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے حوالہ سے قانونی اور سیاسی پہلوؤں پر ایک بے حد اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ توقع غلط نہ ہو گی کہ اپنے مباحث کی بناء پر یہ آج کے اور آنے والے پالیسی سازوں ہی کے لیے نہیں بلکہ بین الاقوامی، سیاسی اور دفاعی امور پر نظر رکھنے والے ماہرین اور طالب علموں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنے گی۔

خالد رحمٰن

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد

داخلی سلامتی اور امن وامان کے مسائل

خارجہ پالیسی کا میدان بنیادی طور پر بیرون ملک تعلقات کا قیام، استحکام اور ان تعلقات میں اپنے ملک کے مفادات کا تحفظ ہے۔ تاہم جس طرح انسانی جسم کے مختلف اعضاء اپنے اپنے وظائف کی انجام دہی میں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور پورے جسم پر اثر ڈالتے ہیں اسی طرح ملکی پالیسیاں خواہ وہ کسی بھی دائرہ سے متعلق ہوں ایک دوسرے پر بھی اور مجموعی طور پر بھی اثرانداز ہوتی ہیں۔

اس ضمن میں خارجہ پالیسی کوئی استثنیٰ نہیں ہے بلکہ ہائی برڈ وار کے اس دور میں تو یہ سلامتی اور امن وامان کے معاملات سے براہ راست جڑی ہوئی ہے۔ پاکستانیوں کا بالخصوص گزشتہ دو دہائیوں کا تجربہ اس کا براہ راست شاہد ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ساتھ تعاون کے نتیجہ میں انہیں داخلی سلامتی، عدم تحفظ اور امن وامان کے کس قدر شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کتاب **"دہشت گردی کے خلاف جنگ: پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات"** کی جلد دوم میں شامل جملہ مضامین پاک امریکہ تعلقات کی اسی جہت کو زیر بحث لاتے ہیں۔

پاکستانی سرحدوں کے اندر امریکی کارروائیاں

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے موقع دیا۔ میں پورے ادب سے یہ بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح اہم موضوعات پر بات کرنے کا ہمارا حق ہے، ہمارے تمام ساتھی سینیٹرز کا بھی حق ہے۔ چنانچہ بحث منعقد کرنے کے لیے جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے، یعنی یہ کہ پہلے سے آپ کو مطلع کر دیا جائے اور پھر آپ تعین کر لیں کہ کس سوال کو لینا ہے اور اس پر گفتگو کے لیے کتنا وقت درکار ہے اور ہمیں تجویز کر دیں کہ ہم میں سے ہر ایک کتنا وقت لے، ہم سب اس کا احترام کریں تو ان شاء اللہ زیادہ مربوط انداز میں یہ کام ہو سکے گا۔

سرحدی خلاف ورزیاں: امریکی سوچ اور عزائم

دھمکیوں کا سلسلہ نیا نہیں: زیر بحث مسئلے کے حوالہ سے آپ کے علم میں یہ بات ہے اور آج اخبارات اس سلسلے میں بھرے پڑے ہیں کہ امریکہ کی قیادت میں اتحادی فوجوں نے ۲ مئی [۲۰۰۴ء] کو پاکستان کی خود مختار سرحدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں یہ پس منظر اہم ہے کہ اس سے پہلے افغانستان میں امریکہ کے سفیر رابرٹ فن (Robert Finn) پچھلے دو مہینوں کے دوران پاکستان پر غیر سفارتی زبان استعمال کرتے ہوئے الزامات لگاتے رہے ہیں اور یہ دھمکی دیتے رہے ہیں کہ ہم خود پاکستانی حدود میں گھس کر جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ کریں گے۔ ۲ مئی کا واقعہ واضح کرتا ہے کہ درحقیقت اب اس پر انہوں نے عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ اس روز ذرائع ابلاغ کے ذریعہ جو چیز سامنے آئی وہ یہ ہے:

پیر کے روز افغانستان واپس جانے سے قبل امریکی کمانڈ میں اتحادی فوجوں نے

پاکستانی حدود میں گھس کر متعدد دکانوں کی تلاشی لی۔ ان ذرائع کے مطابق تحصیل دتا خیل کی لوہارا منڈی میں، جو پاکستانی فوج کے علاقائی ہیڈ کوارٹر سے ۹۰ کلومیٹر مغرب میں واقع ہے، ۶۰ اتحادی فوجی چار ٹرکوں میں سوار تھے، پاکستانی حدود میں ۲ کلومیٹر اندر تک گھس گئے۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ افغان علاقے پکتیا واپس جانے سے قبل اتحادی افواج نے ایک بند دروازے کے تالے کھولے اور بازار میں دکانوں کی تلاشی لی۔

جناب والا! یہ ایک بڑا ہی خطرناک معاملہ ہے جس کے بہت دوررس نتائج ہیں۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ آپ کی توجہ عمومی طور پر مبذول کروانے کے ساتھ ساتھ یہ بات واضح کروں کہ جس پس منظر میں یہ واقعہ ہوا ہے وہ بڑے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ ایک ایسا منصوبہ جس میں امریکہ ہمیں اپنی ایک باج گزار کالونی سمجھ رہا ہے۔ ایک خود مختار، آزاد اور ایٹمی دفاعی صلاحیت رکھنے والی قوم اور ملک سے یہ سلوک ذلت آمیز ہے۔ اس پس منظر میں اس واقعہ سے ایک دن پہلے وہاں فوج کے کمانڈر کا بیان بھی بہت اہم ہے۔ اس بیان میں انہوں نے اسی دھمکی کا اعادہ کیا ہے جو اس سے پہلے ان کے سفیر دیتے رہے ہیں اور اب چوبیس گھنٹوں کے اندر اس پر عمل بھی کر دیا ہے۔

سرحدی خلاف ورزی خود مختاری کی پامالی: جناب والا! یہ بھی آپ دیکھیے کہ وانا میں پچھلے دنوں کیا صورتحال رہی ہے اور میں ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں فوجی قیادت کو کہ اس سے سبق سیکھ کر انہوں نے اس علاقہ میں سیاسی عمل کو آگے بڑھایا ہے۔ اسی ضمن میں اراکین پارلیمنٹ نے بھی ایک کردار ادا کیا، جرگہ ہوا اور یوں سیاسی مسئلے کا سیاسی حل نکالنے کی کوشش کی گئی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس پوری تحریک اور مذاکراتی کوشش کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک واضح خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اس طرح نہ صرف ہماری خود مختاری اور سرحدوں کی پامالی ہوئی ہے بلکہ معاملات کے سیاسی حل کا جو عمل کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اسے تباہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ

واقعہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ آپ دیکھیے کہ اس دوران عراق میں کیا عمل ہو رہا ہے؟ وہاں بھی امریکی فوجیں اسی طرح سرگرم ہیں اور جو سیاسی عمل ہو سکتا ہے اس کو تباہ کرنے کی اسی طرح کوشش کی جارہی ہے۔ اس دوران چوٹ کھانے کے بعد انہیں پیچھے ہٹنا پڑا ہے تو وہ ری پبلکن گارڈز کے لوگوں کو آگے لے جارہے ہیں۔ چنانچہ سارے کا سارا وہی معاملہ ہے جو یہاں ہمارے اوپر دہرایا جارہا ہے۔ اس لیے سب سے پہلی چیز سرحدی خلاف ورزی ہے، اور دوسری پاکستان کی خود مختاری کی پامالی اور اس کا عدم لحاظ جو پاکستان کے لیے ایک انتباہ بھی ہے۔

کارروائی، کمزور جوابی ردعمل کا نتیجہ: جناب والا! امریکی اقدام کے پس منظر میں جو سوچ اور عزائم کارفرما ہیں انہیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت ان کی سوچ یہ ہے کہ جو سیاسی عمل اس علاقے میں ہو رہا ہے اس کو تباہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کا یہ اقدام محض دفتر خارجہ کے پھس پھسے سے تحفظات کے اظہار کی چیز نہیں ہے بلکہ اس ہاؤس کو اس کا سختی سے نوٹس لینا چاہیے۔ پوری قوم کی ترجمانی کرنی چاہیے جو اس پر بے چینی اور تذلیل محسوس کر رہی ہے۔ یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ امریکہ کی محض ایک حرکت نہیں ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ کوئی بھی پاکستانی نائن الیون کے اندر ملوث نہیں تھا امریکہ میں بھی پاکستانی شہریوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ پاکستانی جو امریکہ میں ہیں، آج ہی کے اخبارات کے مطابق ان کے خلاف ایک نئی لہر شروع ہوئی ہے۔ گوانتاناموبے میں بھی ہمارے لوگوں کے ساتھ بدسلوکی کی جارہی ہے؟ وہ ملک جو دنیا میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی بات کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عملاً جمہوریت اور انسانی حقوق کے لیے آج سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے۔

سی این این کی ۵ جنوری ۲۰۰۴ء کی رپورٹ کے مطابق ہمارے لوگوں پر پابندی لگا دی گئی ہے کہ ایئرپورٹس پر ان کے انگلیوں کے نشانات اور فوٹو لیے جائیں گے۔ ہم نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ برازیل جیسے ملک نے بھی یہ جوابی اقدام لیا ہے۔ امریکہ

کے سارے شہری جو برازیل جارہے ہیں ان پر وہی پابندیاں لگائی گئی ہیں جو برازیل کے لوگوں پر امریکہ نے لگائی ہیں۔ برازیل سمیت کم از کم تین ملکوں کے بارے میں یہ واضح ہے جن کا امریکہ سے کوئی مقابلہ نہیں لیکن انہوں نے اپنی عزت اور وقار کے تحفظ کی خاطر بعینہ وہی پابندیاں امریکی مسافروں پر لگائی ہیں جو امریکہ نے ان کے شہریوں پر لگائی ہیں۔ لیکن ہم اس معاملے میں ایک کے بعد دوسری ذلت قبول کرتے جارہے ہیں۔ حالانکہ کسی بھی زیادتی کا مقابلہ کرنا ہمارا حق ہے۔

خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے: اس صورت حال میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح خارجہ پالیسی میں ایک نیا موقع پیدا کیا جائے۔ امریکہ نے اگرچہ اپنے آپ کو پوری دنیا سے، خصوصیت سے مختلف ملکوں کے عوام سے خواہ وہ یورپ میں ہوں اور یا پاکستان اور عرب ممالک میں، علیٰحدہ کرلیا ہے۔ لیکن ہم آنکھیں بند کرکے ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔

جناب والا! اس وقت جو واقعہ ہوا ہے یہ اس پورے سلسلے کا ایک حصہ ہے جس سے آپ علیٰحدہ نہیں ہوسکتے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ سینیٹ اس کا بھرپور نوٹس لے اور حکومت اس معاملے میں عوام کی مرضی اور خواہشات، قومی عزائم، ملک کی عزت، اس کی خود مختاری اور اس کی سلامتی کے تحفظ کے لیے اقدام کرے۔ محض پھس پھسے انداز میں یہ بات کہنا کہ جی وہ آئے تھے، اب چلے گئے ہیں، کافی نہیں ہے۔ اگر ہم نے اس کو روکنا ہے تو روکنے کے لیے ہمیں اپنے عزم کا اظہار کرنا ہوگا مضبوط مؤقف اپنانا ہوگا اور امریکہ کو پیغام دینا ہوگا کہ اب بہت ہوگیا، ہم ایک خود مختار ملک ہیں۔ ہم اپنی عزت، آزادی اور اپنی سرحدوں کا دفاع کریں گے۔ اگر ان کی طرف سے کوئی ایسا اقدام ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہماری فوجوں کو اس کو روکنا چاہیے۔ اسی واقعہ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ جہاں یہ کام کیا گیا ہے اس سے سو میٹر دور ہماری فوج کی چوکی تھی لیکن انہوں نے کوئی جوابی اقدام نہیں کیا۔

جناب والا! صورت حال یہ بن گئی ہے کہ جس کا دل چاہے وہ پاکستان میں آئے، تالے توڑے اور جس کو چاہے پکڑے اور یا ہلاک کردے۔ کیا یہ آزادی اور سلامتی ہے؟ کیا سیکورٹی یہ

ہوتی ہے؟ جناب والا! یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اس لیے میں چاہتا ہوں یہ ایوان اس کا سنجیدہ نوٹس لے۔ (۵ مئی ۲۰۰۴ء)

حملوں کے قانونی، سیاسی و عسکری پہلو

جناب چیئرمین! باجوڑ[1] اور درگئی[2] کے واقعات بڑے ہی تکلیف دہ، خونی اور اندوہناک ہیں۔ میں ان دونوں مقامات پر قیمتی پاکستانی جانوں کے تلف کیے جانے پر اپنے دلی غم کا اظہار کرتا ہوں۔ میں یہ بات بھی کہوں گا کہ ان واقعات کا جو بھی ذمہ دار ہے ہم اس کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔ یہ دونوں واقعات مذمت کیے جانے کے لائق ہیں۔ کسی ایک پر فاتحہ اور دوسرے پر خوشی زیب نہیں دیتی۔ یہ دونوں ہمارے قومی وجود کے اوپر ضرب ہیں۔ ایک معصوم جان کا ضیاع قرآن پاک کے الفاظ میں پوری انسانیت کو تلف کرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا گیا ہے اور جس بے باکی سے کیا جارہا ہے یہ بے حد اندوہناک ہے۔ اس کا نوٹس نہ لینا اور اس روش کو تبدیل کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد نہ کرنا خسارے کا سودا ہے۔

جناب چیئرمین! آج اس بحث کا تیسرا دن ہے اور اس دوران میں بڑے اہم نکات، حقائق اور تجزیہ، دستور، قانون اور خارجہ پالیسی ان تمام ہی امور پر بات چیت ہوئی ہے۔ میرے کچھ ساتھیوں نے افغانستان اور عالمی سامراج کے سلسلے میں کچھ ایسی بحث بھی شروع کر دی ہے جو اگرچہ اہم ہے اور میری نگاہ میں اس پر بھی بات ضرور ہونی چاہیے، لیکن میری رائے میں اس وقت دیگر چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اصل واقعہ اور جو اس سے متعلقہ امور ہیں

---

[1] اشارہ ہے ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۶ء کے واقعہ کی طرف جس میں باجوڑ میں قائم ایک مدرسہ پر بمباری کے نتیجہ میں ۸۰ سے زائد طلبہ اور مدرسین ہلاک ہوئے تھے۔ (گارجین، ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

[2] اشارہ ہے ۸ نومبر ۲۰۰۶ء کو درگئی میں پنجاب رجمنٹ کے مرکز پر خودکش حملہ کی جانب جس میں ۴۰ سے زائد فوجی شہید اور ۲۰ زخمی ہوئے۔ (گارجین، ۸ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

ان پر توجہ کی ضرورت ہے اور میں ان ہی پر بات کروں گا۔ جناب والا! میری کوشش ہو گی کہ حتی الوسع ان چیزوں کو نہ دہراؤں جو میرے ساتھیوں نے کہہ دی ہیں۔ الاّ یہ کہ کسی مقام پر اس کا حوالہ بہت ہی ضروری ہو۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ حقیقی مسائل کیا ہیں۔

میری نگاہ میں بنیادی طور پر تین مسائل ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ واقعہ اور اس واقعے کے دستوری، قانونی، سیاسی اور عسکری پہلو ہیں۔ دوسرا مسئلہ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ ہے جو اس وقت چھٹے سال میں ہے۔ درحقیقت اس جنگ نے پوری دنیا کو تہہ وبالا کر دیا ہے۔ جس طرح خون کی ندیاں بہائی جارہی ہیں اس پر امریکہ ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں تنقید اور احتجاج کا ایک عالمگیر رد عمل سامنے آرہا ہے۔ بدقسمتی سے اس میں جو کردار ہم نے اپنے لیے قبول کر لیا ہے اس کی بناء پر ہم بھی اس رد عمل کا حصہ بن رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم آنکھیں کھول کر حالات کے تجزیے اور اس کے جائزے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے۔ جناب والا! تیسرا مسئلہ پاکستان کی بالخصوص افغان پالیسی ہے۔ میرے نزدیک یہ تینوں پہلو مسئلے کی اہم جہات ہیں۔ میں بہت ہی اختصار سے ان میں سے ہر ایک پر بات کروں گا۔

حملہ کس نے کیا؟: جناب والا! میں اپنے ان ساتھیوں کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ حملہ خواہ امریکہ نے کیا ہو اور یا ہماری فوج نے کیا ہو، غلط ہے۔ لیکن یہ مسئلہ اتنی سادگی سے نمٹایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ حملہ اگر امریکہ نے کیا ہے تو یہ دہرا جرم ہے۔ معصوم انسانوں کو ہدف بنا کر شہید کرنا جرم ہے اور ایک آزاد ملک کی خود مختاری اور آزادی کو پامال کرنا ہے۔ اور یہ جرم پہلی بار نہیں ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی مختلف انداز میں امریکہ یہ کام بار بار کرتا رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سے پہلے جب ۱۹۹۸ء میں جمہوری دور میں افغانستان میں مبینہ طور پر القاعدہ کے ٹھکانوں پر امریکیوں کی جانب سے کروز میزائل داغے گئے تھے تو اس وقت بھی ہماری حدود کو پامال کیا گیا تھا۔ بعد میں ڈمہ ڈولا[1] میں کھلے بندوں یہ کام کیا گیا اور اس

---

[1] باجوڑ کے اس علاقے میں جو افغانستان بارڈر سے ۷ کلومیٹر دور واقع ہے، امریکی فوجوں کی جانب سے ۱۳ جنوری ۲۰۰۶ء کو میزائل داغے گئے جس کے نتیجہ میں ۱۸ افراد شہید ہوئے۔

کے بعد کسی افسوس کا اظہار کرنے کے بجائے بش صاحب نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہ بات کہی کہ ایسے حالات پیدا ہوں گے تو ہم لازماً ایسا ہی کریں گے۔

اس پس منظر میں جناب والا! یہ بات بہر حال متعین ہونی چاہیے کہ حملہ امریکہ نے کیا ہے یا ہماری فوجوں نے کیا ہے اور یا اس میں دونوں کا اشتراک ہے۔ اگرچہ صورت کوئی بھی ہو ایک درجہ میں اس میں ذمہ دار دونوں ہی ہیں۔ لیکن ضروری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ جو شہادتیں اب تک سامنے آئی ہیں وہ سب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ حملہ امریکہ نے کیا ہے اور پاکستانی ہیلی کاپٹر حملہ کے بیس پچیس منٹ کے بعد موقع پر پہنچے ہیں۔ ابتداء میں بی بی سی نے اپنے نشریہ میں کہا اور پھر کئی گھنٹے عالمی ذرائع ابلاغ پر یہ چیز آتی رہی کہ حملہ امریکہ نے کیا ہے لیکن اس کے بعد جب پاکستان نے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تب وہ خبریں روک دی گئیں۔ نیویارک ٹائمز نے دو بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ امریکہ نے یہ حملہ نہیں کیا ہے اور دوسری اس سے بھی زیادہ اہم بات ہے اور یہ میں آپ کو پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔

> صوبہ سرحد کے گورنر ریٹائرڈ جنرل علی محمد جان اورکزئی نے جو بلوچستان کے معاہدے کے مذاکرات کار ہیں، نے کہا ہے کہ وہ مدرسہ پر حملہ کی خبر سن کر دنگ رہ گئے ہیں۔

جناب والا! اس کے بعد میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک نہیں، چار پانچ عالمی ایجنسیاں اپنے اپنے ذرائع سے یہ کہہ رہی ہیں کہ یہ حملہ امریکہ نے کیا ہے۔ آج کے اخبارات کے اندر یہ خبر آسٹریلیا کے اخبار کے حوالے سے آئی ہے کہ جنرل مشرف کے قریبی ذرائع نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حملہ امریکہ نے کیا تھا۔ بلاشبہ ہم نے اس کو اپنے سر لیا ہے لیکن بات اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ ہماری ذمہ داری قبول کیے جانے کے باوجود بھی فائدہ نہیں ہوا۔

جناب والا یہ حقائق ہیں۔ ان کی تفتیش کرنا ضروری ہے۔ جن لوگوں نے تباہ ہونے والے اس مدرسے کا دورہ کیا ہے وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس حوالہ سے وصول ہونے والی مقامی شہادتیں متفقہ ہیں کہ حملہ امریکہ نے کیا ہے۔ پھر آپ دیکھیے کہ حملے میں میزائل جس سمت سے آئے ہیں وہ افغانستان کی سمت ہے۔ عمارت کی جو دیوار سب سے پہلے گری ہے وہ اس طرف کی ہی گری ہے۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں تو پھر آخر پردہ ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ یہ جو کچھ کھیل کھیلا جارہا ہے اسے ختم ہونا چاہیے۔

سچائی کو چھپانے کی حکومتی حماقت: جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حملہ خواہ امریکہ نے کیا ہو لیکن یہ ذمہ داری پاکستان کی ہے۔ یہ تو بڑی حماقت ہم نے کی ہے کہ ہم نے اس کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ ہماری خود مختاری کی پامالی ہے اور رابطہ و تعاون کی بنا پر، جنرل پرویز مشرف، ان کی فوج کی کمان اور جو بھی ان کا نظام ہے وہ برابر کا ذمہ دار ہے بلکہ زیادہ ذمہ داری اس کی ہی ہے۔ اس لیے اہم مسئلہ یہ ہے کہ حقائق کی تفتیش اور واقعات کی ذمہ داری متعین ہو جس کے بعد احتساب بھی ہونا چاہیے تاکہ جو ذمہ دار ہیں ان کی قرار واقعی گرفت ہو سکے۔

جناب والا! یہاں میرے بعض ساتھیوں نے بار بار کہا ہے کہ بہت سا جھوٹا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ میں اس بات کا سامنا کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ بھی اس کا سامنا کریں اور آیئے یہ بات طے کریں کہ قوم کے ساتھ کون جھوٹ بول رہا ہے۔

جناب والا! میں نے خود وہ فلم دیکھی ہے جسے آئی ایس پی آر اپنے مؤقف کی تائید میں دکھا رہا ہے۔ اس کے کچھ حصے جیو ٹیلی ویژن پر بھی آئے ہیں۔ آپ اس فلم کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے کہ اس میں کیا چیز نظر آتی ہے۔ سوا کنال کا ایک قطعہ ہے جس میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ ہے جہاں پانچ کمرے بنے ہوئے ہیں۔ کچھ بچے ایک سرکل کے اندر دوڑ رہے ہیں۔ کچھ افراد ایک کنارے پر ایک لائن میں کھڑے ہوئے ہیں اور کچھ افراد اسی طرح ایک لائن میں دوسری طرف کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ پوری تصویر ہے۔ اس میں کہاں دہشت گردی

ہے؟ اگر دہشت گردی کی تربیت ہے تو پھر ہر وہ سکول جہاں پی ٹی کی تربیت ہو رہی ہے، ہر کالج جہاں کہیں کھیلوں کی تربیت ہو رہی ہے، ہر جم جہاں لوگ ورزش کے لیے جمع ہوتے ہیں وہ دہشت گردی کا مرکز قرار پائے گا۔

جناب والا! اس سے متعلق سوال یہ ہے کہ کیا وہاں کوئی اسلحہ ملا ہے؟ درحقیقت ایسی کوئی رپورٹ سامنے نہیں آئی کہ اس مدرسہ کو فوجی ٹریننگ سے متعلق جوڑا جا سکتا تھا۔ علاقہ کی صورت حال اس کے لائق ہے ہی نہیں۔ پھر پوری تاریخ موجود ہے کہ اس مدرسے میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے اور حفظ قرآن ہوتا ہے ٹھیک ہے کچھ بڑے افراد بھی اس میں شامل تھے لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بات میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے آئی ایس پی آر کے ڈی جی جنرل شوکت سلطان نے یہ کہا تھا کہ اس میں کچھ بچے بھی تھے۔ لیکن آئی ایس پی آر کے ڈی جی کے اس بیان کی تردید جنرل (مشرف) صاحب نے انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز میں اپنی تقریر کے اندر کی۔ شہید ہونے والوں کی اب تک جو لسٹ آئی ہے اس میں ۳۳ کے نام دیے گئے ہیں جس میں سے ۱۸ یا ۱۹ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ۲۰ سال یا اس سے زیادہ کے تھے۔ باقی اسی فہرست میں ۱۳ بچے نو سال سے لے کر کے ۱۶ سال تک کے ہیں۔ اس کے علاوہ شہید ہونے والے ۵۰ افراد ایسے ہیں جن کے بارے میں کوئی معلومات اب تک نہیں دی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان ۸۳ میں سے اگر ۱۷، ۱۸ یا ۲۰ افراد ۲۰ سال سے زیادہ عمر کے تھے تو بقیہ ۶۰ یا ۶۳ وہ بچے تھے جو وہاں زیر تعلیم تھے۔ ان سارے حقائق کا آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس مقام کا دورہ کیا ہے وہ گواہی دیتے ہیں کہ شہید ہونے والے وہاں زیر تعلیم بچے تھے۔ ان کے وہاں بکھرے پڑے جوتے اور کپڑے اس کی گواہی دے رہے ہیں۔ قرآن پاک کے صفحات وہاں موجود ہیں، دینیات کی کتابیں وہاں موجود ہیں لیکن کوئی اسلحہ وہاں سے نہیں ملا۔

جناب والا! ہم سمجھتے ہیں کہ حقائق اور سچائی سب کے سامنے آنی چاہیے اور قوم کو جو غلط بیانی اور جھوٹ سہنا پڑ رہا ہے اس پر سختی سے گرفت ہونی چاہیے۔

کھوکھلا اور بدلتا مؤقف: جناب والا! ہمارا مؤقف کھوکھلا اور مسلسل تبدیل ہوتا رہا ہے۔ پہلے کہا گیا کہ وہاں پر دہشت گردی کی ٹریننگ ہوتی تھی۔ لیکن کیونکہ وہاں سے کوئی اسلحہ اور تخریب کاری کے لیے کوئی چیز نہیں مل سکی اور جسمانی طور پر بھی ایسی کوئی چیز ممکن نہیں تھی تو پھر ایک اور فلسفہ نکالا گیا اور وہ یہ کہ ان بچوں کو خودکش بمباری کے لیے تیار کیا جارہا تھا۔ جناب والا! مجھے بتایئے کہ خودکش بمباری کے لیے کس قسم کی ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے درحقیقت یہ سارے کا سارا ایک ڈھونگ اور کھیل بلکہ ایک مذاق اور ظلم ہے۔ اگلا سوال جناب والا! میں یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیں کہ وہاں ٹریننگ ہو رہی تھی تو سوال یہ ہے کہ آپ تو ان لوگوں سے گفت وشنید کر رہے تھے اور آپ ہی کے مطابق اگلے دن ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہونے والا تھا۔ یہی فقیر محمد، یہی مولانا لیاقت اللہ آپ سے بات چیت کر رہے تھے اور وہ دستخط کرنے والے تھے، اس واقعہ سے دس دن پہلے چھ سے دس افراد کو جنہیں پہلے گرفتار کیا گیا تھا، مذاکرات کے ایک حصہ کے طور پر انہیں رہا کیا گیا ہے۔ یہ سارا ایک منظرنامہ تھا، صاف نظر آرہا ہے کہ مذاکرات کے اس عمل کو سبوتاژ کرنا اصل ہدف تھا اور اس میں امریکہ اور پاکستانی فوج کے وہ ذمہ دار شریک ہیں جو یہ نہیں چاہتے ہیں کہ وہاں حالات کا کوئی حل نکل سکے اور وہ امن کے عمل میں آگے بڑھ سکیں۔

کیا فوجی قوت کا استعمال واحد حل ہے؟: جناب والا! میں یہ سوال بھی اٹھاؤں گا کہ ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے، حتّٰی کہ جنگ میں بھی قوت کا استعمال کسی تناسب سے ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے اگر آپ کے پاس کسی قسم کی غلط سرگرمیوں کے بارے میں اطلاع تھی تو اس علاقے میں آپ کے ۸۰ ہزار فوجی موجود ہیں۔ آپ کے پاس اسلحے کی پوری قوت موجود ہے، ایسے میں صورتحال کو کنٹرول میں لانے کے سو طریقے ہوسکتے تھے۔ مثلاً انہیں گرفتار کرلیا جاتا۔ اس کے بعد آپ کے پاس گواہیاں تھیں جن کی بنیاد پر آپ قانونی کارروائی کرسکتے تھے لیکن آپ نے یہ نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ جس طریقے سے مارا گیا وہ بھی بہت سفاکانہ ہے۔ دنیا بھر میں قاعدہ یہ ہے کہ کسی بھی تصادم میں

اموات کم ہوتی ہیں اور زخمی زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ ۸۳ افراد شہید اور ۳ زخمی ہوئے ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مکمل تباہی کا راستہ اختیار کیا گیا ہے جو نسل کشی ہے اور جو انسانیت کے خلاف بھی جرم ہے اور جنگ میں بھی ایک جرم ہے۔

آزادانہ تحقیقات کی ضرورت: جناب والا! میری نگاہ میں، اور جیسے میرے اور ساتھیوں نے بھی کہا، ان تمام چیزوں کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس معاملے کی آزادانہ تحقیقات ہوں۔ ہم اس معاملہ کو محض دعووٗں کی بنیاد پر نہیں چھوڑ سکتے۔ میری نگاہ میں پارلیمنٹ کی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی اور اعلیٰ سطح پر عدالتی کمیشن تشکیل دیا جائے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ تحقیقات کریں جن میں حقائق کو بھی متعین کیا جائے اور ذمہ داری کو بھی۔ بعد ازاں اس کے مطابق ان تمام لوگوں کا احتساب ہو جو ذمہ دار ہیں، ان میں چاہے چیف آف آرمی اسٹاف ہی کیوں نہ شامل ہو ان سب کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔

حکمت عملی میں تبدیلی کی ضرورت: جناب والا! دوسری جانب میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں اور آپ نے بھی بار بار یہ کہا ہے کہ دہشت گردی کا مقابلہ اسباب کو دیکھے بغیر کبھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہی ہے کہ آپ اسباب کو جانے بغیر محض قوت سے ایک مسئلے کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور اب تک کی ناکامیوں سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں ہیں۔ بش کی پوری کی پوری مہم سر دست ناکام رہی ہے، اس مہم نے دہشت گردی کو فروغ ہی دیا ہے۔ نئے دہشت گرد تیار کیے ہیں اور پوری کی پوری دنیا کو انتہا پسند بنا دیا ہے، آپ بھی یہی کام انجام دے رہے ہیں۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ خود آپ کے جو گورنر صاحب [لیفٹیننٹ جنرل (ر) علی محمد جان اورکزئی] ہیں ان کا اس بارے میں بڑا اہم بیان آیا ہے۔ فی الواقع یہ بیان سننے کے لائق بھی ہے اور نوٹ کرنے کے لائق بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ”واشنگٹن، نیٹو اور افغان حکومت اس حقیقت سے آنکھیں بند کر رہی ہے کہ عسکریت پر مبنی حکمت عملی معاملات کو مزید خراب کر رہی ہے۔ یا تو معاملہ فہمی کی کمی ہے یا اپنی ناکامیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ جیسا کہ عراق میں

ہوا، غلطیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں کیا گیا۔ انہوں نے بہت بڑی قیمت ادا کرنے کے بعد اب اپنی غلطیاں تسلیم کر لی ہیں"۔

جنرل اور کزئی نے کہا: "صرف طالبان سے لڑنے کے بجائے، نیٹو افواج کو اب افغانستان کی پشتون نسلی اکثریت کی طرف سے ایک وسیع بغاوت کا سامنا ہے جو اندھا دھند بمباری، معاشی بدحالی اور سنوائی نہ ہونے کی وجہ سے الگ ہو چکے ہیں۔ عوام نے طالبان میں شامل ہونا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک قوم پرست تحریک ہے جو اکٹھا ہو کر پھل پھول رہی ہے۔ یہ ایک طرح کی مزاحمت کی جنگ بن رہی ہے"۔

جناب والا! یہ کوئی اور نہیں، خود آپ کا مقرر کردہ گورنر کہہ رہا ہے اور آپ اسی غلطی کو دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں!

افغان پالیسی پر نظر ثانی کی ضرورت: جناب والا! میں آخری بات یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنی پوری افغان پالیسی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ پارلیمنٹ اس پر کھل کر بحث کرے، ماضی میں جو غلطیاں کی گئی ہیں، ان کی اصلاح ہونی چاہیے۔ افغانستان کے لوگوں کا یہ حق ہے کہ وہ جو بھی نظام پسند کریں اپنی آزاد مرضی سے اسی نظام کو چلائیں۔ طالبان بھی اسی طرح افغانستان کا حصہ ہیں جس طرح باقی لوگ ہیں۔ ہمیں کسی ایک کو پسندیدہ اور دوسرے کو مخالف نہیں بنانا چاہیے بلکہ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہمارا یہ پڑوسی ہر اعتبار سے ہمارا دوست ہو۔ پچھلے سالوں میں ہم نے جو ساکھ بڑی قیمت ادا کر کے حاصل کی ہے، ہم آج اس سے محروم ہو چکے ہیں اور اس طرح آپ نے مشرقی محاذ کے ساتھ ساتھ، مغربی محاذ کو بھی کھو دیا ہے۔

جناب والا! میں آخر میں باجوڑ کے لوگوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ بات یاد دلاؤں گا کہ آج نہیں بلکہ تقسیم کے بعد سے اس پورے علاقے نے پاکستان کے ساتھ جس

وفاداری، محبت اور تعاون کا اظہار کیا ہے وہ بے مثال ہے، خدا کے لیے اس ساکھ کو ختم نہ کیجیے۔ میں یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں اسی علاقے میں ایک بڑا اہم واقعہ ہوا تھا، اس زمانے کے افغان حکمران (ظاہر شاہ) جو اس علاقے کو غیر مستحکم کرنا چاہتے تھے، انہوں نے یہاں بغاوت کرانے کی کوشش کی تھی لیکن علاقہ کے لوگوں نے مزاحمت کی، اس سازش کو ناکام بنایا اور پاکستان کے جھنڈے کو بلند کیا۔ اس علاقے کے لوگوں کی یہ قربانیاں ہیں، خدا کے لیے اس کا صلہ، ان کو یہ نہ دیجیے کہ آپ خود یا آپ کے ایماء پر امریکی اس طرح ان کو، ان کے بچوں اور ان کے اہل علم کو ہلاک کریں، خون بہائیں اور نفرت کی آگ بھڑکائیں۔ یہ کسی طرح پاکستان کے مفاد میں نہیں ہے۔ آنکھیں کھولیے اور اس پالیسی کو بدلیے، ہم اس طرح ہی اس بحران سے نکل سکتے ہیں۔

ملک میں فیصلہ سازی کا طریقہ کار: جناب والا! صورت حال کی مکمل اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب ایک فرد کا اقتدار جو عقل کل بن کر ہمارے ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اس سے ہم جان چھڑائیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کچھ معاملات میں ہمارے اور آپ کے نظریاتی اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن اس وقت ملک کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہے۔ باجوڑ اور درگئی کے واقعات نہ ہوتے، اگر ملک میں حقیقی جمہوری نظام اور احتساب کا نظام ہوتا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اگر میں جنرل صاحب کی کتاب کے انگریزی اور اردو متن ساتھ ساتھ رکھوں تو اس کا صحیح نام بنتا ہے 'In the Line of Fire, Pakistan First'۔ یہ ہے ان کا کارنامہ۔ یاد رکھیے کہ ہم اسی وقت ترقی کی طرف بڑھ سکتے ہیں جبکہ ہم پالیسیوں اور اس سے بڑھ کر اس نظام کو بدلنے کی کوشش کریں جو قومی مفادات کے برعکس پالیسیوں کی تشکیل کا سبب ہے۔ (۲۸ نومبر ۲۰۰۷ء)

کارروائیوں کا نیا مرحلہ: پاکستانی سرزمین پر امریکی فوجی

جناب چیئرمین! جیسا کہ آپ نے فرمایا اس مسئلے پر میں نے پوائنٹ آف آرڈر کے

لیے آپ سے اجازت طلب کی تھی۔ مجھے خوشی ہے کہ قائد ایوان نے تائید کی اور آگے بڑھ کر اس مسئلے کو اٹھایا۔ جہاں تک مشترکہ قرارداد کا تعلق ہے، ہم اس کے لیے تیار ہیں اور مجھے توقع ہے کہ قائد ایوان اس کا مسودہ ہمیں دکھا کر منظور کروالیں گے۔ لیکن مسئلہ صرف قراردادوں کا نہیں ہے۔ پہلے ذرا حقائق کو سمجھ لیجیے کہ کیا ہیں۔

میرے پاس موجود ریکارڈ کے مطابق ۲۰۰۴ء سے اب (۲۰۰۸ء) تک امریکہ اور ISAF کی افواج ۹۰ سے زیادہ بار پاکستان کی آزاد حدود کی خلاف ورزی کر چکی ہیں۔ ان میں چھوٹی خلاف ورزیاں بھی شامل ہیں اور وہ بڑی خلاف ورزیاں بھی ہیں جن میں ان کے غارت گروں نے ہمارے یہاں آکر لوگوں کو مارا ہے۔ عام اور معصوم شہریوں کو مارنے کے علاوہ علاقوں کے علاقے تباہ کیے ہیں۔ حتٰی کہ (باجوڑ میں) ایک مسجد و مدرسے کو تباہ کیا اور اسی طرح تازہ ترین واقعہ کل انگور اڈہ (جنوبی وزیرستان) کے علاقے میں ہوا ہے۔[1]

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ آج تک وہ صرف فضا سے موت پھینکا کرتے تھے لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ ان کے تین ہیلی کاپٹر ہماری زمین پر اترے ہیں۔ ان ہیلی کاپٹروں میں جو فوجی تھے انہوں نے باہر نکل کر اندھا دھند فائرنگ کی ہے۔ اور جہاں یہ سب کچھ ہوا وہ علاقہ نہ کوئی تربیتی کیمپ تھا، نہ وہاں پر طالبان کا یا کسی اور گروہ کا کوئی مرکز تھا۔ عام شہری اور دیہاتی لوگوں پر اس فائرنگ کے نتیجہ میں میری اطلاع کی حد تک ۲۷ افراد شہید ہو چکے ہیں جن میں بڑی تعداد خواتین اور بچوں کی ہے۔ یہ اندھا دھند فائرنگ کرنے والے فوجی کئی گھنٹے وہاں موجود رہے ہیں اور جناب والا! یہ اس کے باوجود ہوا کہ خود آئی ایس پی آر کے نمائندے کے

---

[1] اے بی سی نیوز، امریکہ ۱۶ ستمبر ۲۰۰۸ء کی رپورٹ کے مطابق امریکی اسپیشل آپریشن فورسز نے پہلی بار پاکستان میں جنوبی وزیرستان کے علاقے انگور اڈہ کی ایک عمارت پر دہشت گردی کے شبہ کی بنیاد پر زمینی اور ہوائی افواج کی مدد سے حملہ کیا جس میں عورتوں، بچوں سمیت ۲۰ افراد شہید ہو گئے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ نے اس حملے کو بڑی اشتعال انگیزی قرار دیا اور اس واقعہ کی شدید مذمت کی، اسلام آباد میں امریکی سفیر اینی پیٹرسن کو وزارت خارجہ طلب کر کے احتجاجی نوٹ بھی دیا گیا۔

ٹی وی پر اعتراف کے مطابق اس مقام سے دو کلو میٹر پر پاکستان کی چوکی موجود تھی۔ سوال یہ ہے کہ وہ فوجی چوکی کیا کر رہی تھی؟ کیا وہاں موجود ہمارے فوجی دو گھنٹوں تک جوتے پہن رہے تھے؟ کسی کارروائی کے لیے ان کے پاس کوئی احکامات کیوں نہیں تھے؟ یہ دوسری بنیادی حقیقت ہے، جو ہمیں سامنے رکھنی چاہیے۔

جناب والا! تیسری بات اس حوالہ سے پہلے سے موجود کھلے امریکی اعلانات سے متعلق ہے۔ اگر آپ کی نگاہ بین الاقوامی پریس پر ہو تو میں آپ سے صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جولائی ۲۰۰۸ء کے پورے مہینے میں امریکہ کے پالیسی ساز اور افغانستان کی موجودہ حکومت اور اس کے نمائندے یہ بات کھلے بندوں کہتے رہے ہیں کہ اب لڑائی کو پاکستان کی سرزمین پر ہونا ہے اور ہمیں جنگ کو یہاں تک وسیع کرنا ہے۔ اگر آپ حوالہ چاہتے ہیں تو سب سے اہم مضمون وہ ہے جو ناروے میں تعینات افغانستان کے سفیر جاوید الدین نے گارجین ۲۰۰۸ء میں لکھا ہے۔ اس مضمون میں اس نے صاف کہا کہ ہماری حکمت عملی آئندہ کے لیے یہ ہے کہ پاکستان کو جنگ کا مرکز بنانا ہے۔ اگر آپ کے سامنے تازہ (ستمبر/اکتوبر ۲۰۰۸ء) کافارن افیئرز ہو جو ابھی کل ہی سامنے آیا ہے تو اس میں بھی آپ کو اسی سوچ کی جھلک نظر آئے گی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ: افغانستان اور پاکستان کے بارے میں پالیسیوں میں بہت کم باہمی تعلق اور ارتباط نظر آتا ہے حالانکہ دونوں ممالک اب جنگ کے لیے مشترکہ میدان کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

جناب والا! یہ ہے وہ فکر جسے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ اسی حوالہ سے میں آپ کی توجہ ہندوستان کے سینئر صحافی پرافل بِدوائی (Praful Bidwai) کے مضمون کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ یہ مضمون بھارت کے اخبار دی ہندو (The Hindu) میں شائع ہوا ہے اور بعد ازاں دی نیوز (The News) میں ہمارے یہاں بھی شائع ہوا ہے۔ ۱۲ اگست کے اس مضمون میں اس نے صاف کہا ہے کہ:

(پاکستانی) فوج پر امریکہ کی طرف سے بہت دباؤ ہے کہ وہ افغانستان کی سرحد کے

ساتھ بدامنی کے علاقے میں طالبان کے خلاف اپنی کارروائیاں بڑھائے یا امریکہ کی زیر قیادت بین الاقوامی سیکورٹی فورسز کو سرحد پار سے جنگجوؤں کے خلاف چھاپے مارنے کی اجازت دے۔ فرنٹیئر کور اس کے لیے راضی نہیں ہے۔ اور طالبان کے حامی عناصر سے لڑنے کے قابل نہیں۔ فوج کی اتھارٹی جس کی مقبولیت کا بہت ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا، گھٹتے گھٹتے بالکل نچلی سطح پر آچکی ہے۔

ہمارا جوابی طرز عمل: جناب والا! یہ کوئی اچانک واقعہ نہیں ہوا بلکہ یہ پورا منظر نامہ طے شدہ ہے۔ اس سیاق و سباق میں، کسی ناانصافی کے بغیر میں تسلیم کرتا ہوں کہ بلا شبہ موجودہ (پیپلز پارٹی) حکومت نے مشرف کے دور کی حکومت کے مقابلے میں کم از کم زبانی احتجاج کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ زبانی احتجاج غیر مؤثر ہے، یہ کبھی کار آمد نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔ جو قوم اپنی آزادی و خود مختاری کا دفاع کرنے کو تیار نہ ہو، اس کی آواز کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ آزادی بیانات، اپیلوں اور منتیں کرنے سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے اٹھنا اور سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے خلاف اقدامات کے لیے اس حوالہ سے ہمارے کمزور مؤقف اور طرز عمل نے اُن کی ہمت بندھائی ہے کہ وہ پاکستان کو طعنہ بھی دیں اور اقدام بھی کریں۔ اب تک وہ صرف ہوائی قوت استعمال کر رہے تھے، کبھی ہیلی کاپٹر جو پائلٹ والے تھے اور کبھی غارت گر ڈرون جو بغیر پائلٹ تھے، ہماری حدود کی خلاف ورزیاں کر رہے تھے۔ لیکن چونکہ ہم نے جواب نہیں دیا، اپنی خود مختاری، اپنی حدود اور سرحدوں کا دفاع نہیں کیا، اسی لیے انہوں نے اب زمینی حملہ کرنے کی **جراءت** بھی کر لی۔ دوسری جانب ان سے مقابلہ کے بجائے ہم نے اپنی فوج کو اپنے لوگوں کو مارنے، علاقوں کو تباہ کرنے اور تین سے پانچ لاکھ افراد کو بے گھر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ امریکہ اب پوری دیدہ دلیری اور درندگی کے ساتھ، ہماری سرحدوں کو روندتا اور ہمارے لوگوں کو مارتا رہا اور ہم انہیں روک نہیں سکے۔ یہ صورت حال جاری رہنا کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ اس کو روکنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ خواہ ان کے فوجی آئیں یا ان کے غارت گر ڈرون اور

ہیلی کاپٹر، آپ انہیں مار گرائیں۔ یہی وہ زبان ہے جو وہ سمجھ سکتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت یہ ہمارا حق ہے اور قوم سے وفاداری کا تقاضا اور ہماری ذمہ داری ہے۔ محض سیاسی بیان دے دینا اور سفیر کو بلا کر احتجاج کر لینا ہر گز کافی نہیں ہے، وہ ہمارے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا۔

جناب والا! میں زور دے کر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایوان حکومت سے مطالبہ کرے کہ ان تمام دخل اندازیوں اور مداخلتوں کی شدید مذمت کرے، یہ ہماری خود مختاری کی خلاف ورزی ہے اور جنگی کارروائی ہے۔ جو قوت ہمارے پاس ہے، اس سے ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جو آزادی کی حفاظت کرنا جانتے ہیں اور جو ضمیر کی قوت رکھتے ہیں، ان کے لیے طاقت کا عدم تناسب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ طاقت کا عدم تناسب دنیا میں ہمیشہ موجود رہا ہے، لیکن باعزت قومیں اپنے دفاع کے لیے جواب دیتی ہیں اور دینا چاہیے۔ میں آپ کو مثال دینا چاہتا ہوں کہ طاقت کے بے پناہ عدم توازن کے باوجود لبنان میں حزب اللہ نے کس طرح اسرائیل کی جدید ترین آرمی کا مقابلہ کیا اور اسرائیل کو منہ کی کھانی پڑی۔ بلاشبہ یہ صرف ہمت، عزم اور حوصلے سے ہو سکتا ہے۔

پاکستانی فوج کوئی معمولی فوج نہیں ہے۔ ہم نے اس کو پالا ہے، اس قوم نے اس کے لیے قربانیاں دی ہیں اور یہ دنیا کی چوتھی یا پانچویں آرمی ہے۔ کیا اس کے باوجود ہم اپنی سرحدوں کا دفاع نہیں کر سکتے؟ اور اگر نہیں کر سکتے تو پھر قوم یہ سوال کرے گی کہ ہم کیوں ایسی فوج کو پالنے کے لیے اربوں روپیہ خرچ کریں اور لوگ غربت اور بے روزگاری کا شکار رہیں۔ ہم اپنی معاشی ترقی اور بھوک اور فاقے کو مٹانے کے پروگرام کو مؤخر کر کے اپنے دفاعی اداروں کو سپورٹ کرتے ہیں اور بہترین اسلحہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر اس کے باوجود بھی یہ دفاع نہیں کر سکتے ہیں تو پھر قوم کو نظر ثانی کرنا پڑے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔

ہماری فوج کی شاندار روایات ہیں، تربیت ہے، جذبہ ہے اور سب سے بڑھ کر اس

فوج کا نعرہ ہے ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ۔ ہم اس فوج سے توقع رکھتے ہیں اور اس سول حکومت سے توقع رکھتے ہیں جو جمہوری حکومت ہے کہ یہ جمہوری حکومت، جمہور کے جذبات اور ملک کے مفادات کی خاطر ہمت سے کام لے۔ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم امریکہ سے کہہ دیں کہ اب بہت ہو گیا جناب والا! جب تک آپ یہ رویہ اختیار نہیں کریں گے، ان کا طرز عمل تبدیل نہیں ہو گا۔ (۴ ستمبر ۲۰۰۸ء)

پاکستان کو کیا کرنا چاہیے؟

پاکستان میں ہونے والی امریکی جنگی کارروائیوں پر میرا نقطہ نظر بھی ذاتی، جماعتی یا گروہی نہیں ہے۔ میں ایک پاکستانی اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں اور میاں رضا ربانی صاحب کے اس جذبے کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ وہ اسے ایک قومی مسئلے کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری درخواست ہو گی کہ یہ ایوان بھی اسی انداز میں مسئلے پر غور کرے۔

آپ کو معلوم ہے جناب والا! کہ بالعموم جب ایوان میں بجٹ رکھا جاتا ہے تو کوئی اور بحث نہیں ہوتی۔ لیکن اس بات کے علم کے باوجود جیسے ہی پاکستان میں امریکی جنگی کارروائی کے بارے میں یہ اطلاع[1] ملی، میں نے باقاعدہ فوری توجہ دلاؤ نوٹس آپ کو بھیجا اور سیکرٹری قومی اسمبلی سے درخواست کی کہ اگر 'توجہ دلاؤ نوٹس' ممکن نہ ہو تو 'پوائنٹ آف آرڈر' پر اس مسئلے کو لیا جائے۔ میں خیر مقدم کرتا ہوں کہ قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف دونوں نے اپنے اپنے مختلف انداز کے باوجود مسئلے کی اہمیت اور مرکزیت کو محسوس کیا ہے۔ ہمارے پیش نظر بحیثیت سینیٹ آف پاکستان کے اس مسئلہ کا سنجیدہ نوٹس لینا اور صرف نوٹس لینا ہی نہیں بلکہ مسئلے کی تہہ تک پہنچنا اور اس کے لیے صحیح حکمت عملی وضع کرنا ہے۔

---

[1] اشارہ ہے ۱۰ جون ۲۰۰۸ء کے اس واقعہ کی طرف جس میں پاکستان آرمی کے ایک میجر اور ۱۰ نیم فوجی جوان قبائلی علاقہ میں امریکہ کے ایک فضائی حملہ میں شہید ہوئے۔ امریکہ کا کہنا تھا کہ یہ حملہ اتفاقیہ تھا۔ (نیویارک ٹائمز ۱۲ جون ۲۰۰۸ء)

جناب والا! امریکی کارروائیوں کے حوالہ سے معاہدات کی بات ہوئی ہے، میں الجھنا نہیں چاہتا، لیکن ریکارڈ کی درستگی کے لیے یہ بات جاننا ضروری ہے کہ امریکی اور نیٹو افواج کی پاکستان کی آزاد حدود کی یہ پہلی خلاف ورزی نہیں ہے۔ اس سے پہلے ۳۸ خلاف ورزیاں ہو چکی ہیں اور سارا ریکارڈ موجود ہے کہ ان میں سے چار موجودہ حکومت کے زمانے میں اور ۳۴ پچھلی [مشرف] حکومت کے زمانے میں ہوئیں۔ جناب والا! اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ امریکہ کی ایک مستقل اور متواتر پالیسی ہے۔ پچھلی حکومت نے اس معاملے میں نہایت بزدلی دکھائی اور کوئی بروقت جوابی اقدام نہیں کیا۔ مغربی ذرائع ابلاغ میں، الیکٹرونک میں بھی اور پرنٹ میڈیا میں بھی، ایک بار نہیں بار بار یہ بات آئی ہے کہ ۳۸ میں سے کم از کم نصف مواقع ایسے ہیں جس کا امریکہ نے دعویٰ کیا یا انہوں نے رپورٹ کیا۔ اس کے بعد اگرچہ ہم برابر یہ کہتے رہے کہ انہوں نے اقدام نہیں کیا اس کے باوجود انہوں نے دعویٰ واپس نہیں لیا۔ ظاہر ہے اسی بناء پر آج ان کی جرأت بڑھ رہی ہے۔ جناب والا! میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ ہمارے صبر اور ہماری عزت و غیرت کو ٹیسٹ کر رہا ہے اور ساتھ ہی مشتعل بھی کر رہا ہے۔ اس پورے پراسیس میں اپنے ہدف کے مطابق آہستہ آہستہ وہ اپنے قدم بڑھا رہا ہے۔ یہ آگ کے لہراتے شعلے ہیں اور یہ اس بات کی دھمکی ہے کہ وہ پاکستان کو نشانہ بنانے کے اس معاملے میں منتخب کر رہے ہیں۔

جناب والا! یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ چالیس یا پچاس افراد کی شہادت، جس میں ہمارے گیارہ فوجی بھی شامل ہیں، کس طرح نظر انداز کی جاسکتی ہے؟ اور ہو سکتا ہے کہ یہ ابھی حتمی اور آخری اعداد نہ ہوں۔ میرے پاس بی بی سی کی تازہ ترین رپورٹ ہے جس میں ان کی نمائندہ یہ کہتی ہے کہ ہیلی کاپٹرز کے ذریعے لاشوں کو پشاور لایا جا رہا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی یا کوئی مقامی بات نہیں ہے بلکہ جو کچھ معلومات ملی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے حملہ کا ہدف ہماری ایک چوکی پر قبضہ کرنا تھا اور اسی قبضے کے لیے یہ کام کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام شہریوں کے علاوہ فوجی بھی اس میں شہید ہوئے ہیں۔ انہیں براہ راست نشانہ بنایا گیا ہے۔

میری اطلاع یہ ہے کہ کچھ وقت کے لیے باقاعدہ چوکیوں پر قبضہ کیا بھی گیا ہے۔ یوں یہ کسی بھی طرح کوئی معمولی معاملہ نہیں ہے۔

میں ساتھ ہی یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جس چیز کو امریکہ دہشت گردی کے خلاف کہہ رہا ہے، وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں وہ اس علاقے میں امریکہ کے تزویراتی اور ارضی مفادات کو آگے بڑھانے کی طویل مدت منصوبہ بندی ہے۔ امریکی منصوبہ ساز صاف کہہ رہے ہیں کہ ہم یہاں آئے ہیں اور یہاں رہیں گے۔ فی الحال کم از کم دس سال کا پروگرام ان کی دستاویزات میں آرہا ہے۔ اس خطے پر قبضہ کر کے وہ وسطی ایشیا، پاکستان، ایران، چین اور روس کو بھی زیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس میں ہم ان کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ نہ صرف آلہ کار، بلکہ نشانہ بھی بن رہے ہیں۔

پھر میں یہ بھی عرض کروں کہ امریکہ خوشامد کی زبان نہیں سمجھتا۔ آپ ہر موقع پر پسپائی اختیار کرتے ہیں یا معمولی سا احتجاج کر لیتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ صاف کہہ دیا جائے کہ آئندہ سرحدوں کی خلاف ورزی کے معنی پاکستان کے خلاف جنگ ہو گا۔ ہم ایک جوہری طاقت ہیں۔ امریکہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کے بیس ہزار فوجی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ہمیں شکست دے سکتا ہے تو اس کو یاد دلایئے کہ اس کے ایک لاکھ ستر ہزار فوجی عراق میں ہیں اور یہ کوئی راز نہیں کہ وہ کس طریقے سے جوتیاں کھا رہے ہیں اور کس ذلت کا شکار ہو رہے ہیں۔ بلاشبہ قومی سطح پر ہم ایسے گئے گزرے نہیں لیکن اس کے لیے قیادت کی سطح پر ایک جرأت، ویژن اور سیاسی عزم کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لیے پوری قوم کو ساتھ دینا ہو گا۔ یہ کام محض وزیر دفاع اور وزیر اعظم کا نہیں ہے، یہ پوری قوم کا کام ہے اور میں چاہوں گا کہ اس ہاؤس میں اس حوالہ سے متفقہ قرارداد پاس ہو کہ اب بہت ہو گیا قوم اسے برداشت نہیں کرے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہم واضح کریں کہ اب تک کی جو حکمت عملی ہے اس پر دوبارہ غور کر کے نئی حکمت عملی تشکیل دی جائے تاکہ ہم سب مل کر پاکستان کے مفاد میں کام کریں۔

اس سلسلہ میں ہمیں افغانستان کو بھی اپنی حد تک متوجہ کرنا چاہیے۔ ابھی افغانستان کا وفد آیا تو میں نے یہ بات ان سے بھی کہی کہ خود افغانستان کو امریکہ سے اور نیٹو سے کیا خطرہ ہے اور نیٹو کس طریقے سے اپنا ایک نیا کردار تشکیل دے رہا ہے۔ افغانستان سے نیٹو کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ نیٹو تو یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ تھا، اس کے کردار میں توسیع کر کے اسے افغانستان میں لانا ایک خاص نقطہ نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ خطرہ افغانستان کو بھی ہے اور ہمیں بھی ہے اور یہاں ہمیں یکسو ہونا چاہیے کہ نہ ہم افغانستان کے معاملات میں مداخلت کریں اور نہ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت کرے۔ ہمیں جو مستقل خطرہ ہے اس کے لیے ہم تیار ہوں۔

جناب والا! یہ بڑا اہم معاملہ ہے، میں پوری دردمندی کے ساتھ حکومت سے بھی اور اپوزیشن سے بھی درخواست کروں گا کہ آیئے! جو اصل خطرہ ہمیں امریکہ سے ہے اس کا مل کر سامنا کریں اور ایک واضح پیغام دیں کہ اب اس کے بعد جو بھی اقدام ہو گا اسے جنگی کارروائی سمجھا جائے گا اور ہم پوری قوت سے جواب دیں گے۔ ہمارے حکمران بار بار کہتے ہیں کہ ہم آئندہ ایسے کسی اقدام کی اجازت نہیں دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ آپ سے پوچھ کون رہا ہے؟ کون سا وہ آپ کے جہاز میں جا رہے ہیں کہ آپ کی اجازت انہیں درکار ہو گی۔ اس کے برعکس اگر ان کو پتا ہو گا کہ وہ آئیں گے اور انہیں جوابی کارروائی کا سامنا ہو گا تو وہ نہیں آئیں گے۔ اس وقت تو ان کو اندازہ ہے کہ وہ آئیں گے، آپ کو ماریں گے اور اس کے بعد پھر آپ خوشامدانہ انداز میں کبھی کبھی کوئی احتجاج بھی کریں گے۔ ظاہر ہے اس سے ان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لیے اب ہمارا رویہ بدلنا چاہیے۔ یہ وقت تبدیلی کا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا آغاز اور اظہار آج ہم سینیٹ سے ایک آواز ہو کر کریں۔ اس تناظر میں مشترکہ قرارداد آئے تو میں اس کی پوری پوری تائید کروں گا بلکہ میری خواہش ہے کہ سینیٹ کو اس معاملے میں پہل کر کے ایک واضح پیغام دے دینا چاہیے۔

(۱۱ جون ۲۰۰۸ء)

ایبٹ آباد آپریشن (۲۰۱۱ء)

جناب چیئرمین! میں سب سے پہلے بڑی درد مندی کے ساتھ آپ اور قائد ایوان کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں گا کہ یہ ایوان، ایوان بالا ہے اور یہاں ہم سب کو اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس رہنا چاہیے کہ جن حالات سے ملک گزر رہا ہے، جو بین الاقوامی خطرات اس وقت ہمیں لاحق ہیں اور جس طرح ہماری خود مختاری کو پامال کیا جارہا ہے، اس پر قوم کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ مجھے کہنے دیجیے کہ جس بے زاری کے ساتھ درباری انداز میں یہ ایوان چل رہا ہے وہ کسی طرح بھی اطمینان کے قابل نہیں ہے۔ دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ صدر مملکت کی تقریر پر آج کوئی بھی شخص بولنے کے لیے تیار نہیں تھا، کیا یہ حکومت، صدر یا ایوان پر عدم اعتماد کا ووٹ ہے؟

حکومت بحث سے گریزاں کیوں

جناب والا! دوسری بات میں آپ سے اکثر کہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ کل اسامہ بن لادن کے سلسلے میں ایبٹ آباد میں امریکہ کے فوجی اقدام[1] کے بارے میں اس ایوان نے مسئلے کو اٹھایا اور ہم نے درخواست کی بلکہ مطالبہ کیا کہ وزیر اعظم (یوسف رضا گیلانی) صاحب ایوان میں تشریف لائیں اور حقائق ایوان اور قوم کے سامنے رکھیں۔ ہمیں قائد ایوان نے یقین

---

[1] ۲ مئی ۲۰۱۱ء، سی آئی اے کی قیادت میں امریکی افواج کے خصوصی دستوں نے جو ہیلی کاپٹروں پر آئے تھے، مشترکہ آپریشن کر کے القاعدہ کے رہنما اسامہ بن لادن کو جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ایبٹ آباد میں رہائش پذیر تھے ہلاک کر دیا اور ان کی لاش کو پہلے افغانستان منتقل کیا گیا بعد ازاں سمندر میں بہا دیا گیا۔ اس آپریشن کے دوران امریکی فوجی دستوں کو پاکستان میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، آپریشن کی نگرانی خود صدر باراک اوباما نے کی۔

دلایا کہ وہ فوراً رابطہ کر رہے ہیں اور ایوان سے یہ بات بھی کہی گئی کہ وہ آدھے گھنٹے کے اندر ضرور تشریف لا سکیں گے۔ لیکن آج ہم دوسرے دن مل رہے ہیں اور ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ہے۔ جو سوالات ابھرے ہیں اور جس طرح پاکستان کے خلاف پوری دنیا میں ایک مہم چل رہی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ایوان اس صورت حال پر تفصیلی غور کرے۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ گارجین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اب اصل ہدف پاکستان ہے اور پاکستان کو انتہائی برے حالات کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس دوران آئی ایس آئی کے سربراہ (لیفٹیننٹ احمد شجاع پاشا) سے جو بیان منسوب کیا گیا ہے، دفتر خارجہ نے بھی رد عمل دیا، وزیر اعظم کا بیان ہے، جبکہ فوج کی طرف سے خاموشی ہے، ان چاروں کی الگ الگ پوزیشن سامنے آ رہی ہے۔ یہ سب کچھ تشویشناک ہے۔ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں۔ وزیر اعظم صاحب یہاں پر آ کر ہمارے سامنے حقائق کیوں نہیں لاتے۔ ان سے سوال کیجیے کہ جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا کیا بنا؟ آخر یہ ایوان کس لیے ہے؟ ورنہ اگر ہمیں جواب نہ ملا تو ہم اس پر واک آؤٹ کریں گے۔ (۳ مئی ۲۰۱۱ء)

جناب والا! آپ نے اس ایوان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ پوائنٹ آف آرڈر کی بنیاد پر، اس سے پہلے ایک بار نہیں بار بار بحث ہوئی ہے، یہ ہماری روایات کا حصہ ہے۔ اگر حکومت رولز کا سہارا لے کر اس مسئلہ پر بحث کو روکنا چاہ رہی ہے تو میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ جو متعلقہ دفعات بحث میں حائل ہیں ان کو معطل کر کے رول ۱۹۴ کے تحت امریکہ کی جانب سے ایبٹ آباد میں کارروائی کے اس موضوع پر اس ایوان میں فی الفور بحث کا آغاز کیا جائے۔

ہم آپریشن کے حوالہ سے حکومتی مؤقف کو چیلنج کرتے ہیں کیونکہ یہ بہانہ بازی اور معذرت خواہانہ رویہ شرمناک ہے۔ ہماری خود مختاری کو پامال کیا گیا ہے اور ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہو گا ہمارے انٹیلی جنس ادارے ناکام رہے ہیں اور ہماری فوج ملک کی دفاع کی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکی، اگر ایوان اس کا نوٹس نہیں لے گا تو پھر کون لے گا۔

جناب چیئرمین! میں اپنی گزارشات کا آغاز کرنے سے پہلے آپ کو اور اس ہاؤس کو، بشمول لیڈر آف دی ہاؤس مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس وقت اس اہم ترین قومی مسئلے پر ہماری تحریک کو قبول کیا اور فوری طور پر اس مسئلے پر گفتگو کا آغاز کیا۔ میری نگاہ میں یہ پاکستانی قوم کا ہمارے اوپر ایک قرض اور حق تھا اور ہم اسے ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم یہ کوشش اس جذبے کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ہمارا مقصد پاکستان کا تحفظ، پاکستان کی ترقی، پاکستان کی خود مختاری اور پاکستان کے دستور کی بالادستی کے لیے ہے۔ اس وقت پاکستان جس عالمی دباؤ کے نرغے میں ہے، جس طرح ہمیں ترنوالہ سمجھ کر دبوچا جا رہا ہے، ہماری تذلیل اور مذاق اڑایا جا رہا ہے، ہمیں زیر نگیں کیا جا رہا ہے اور ہماری خود مختاری کو پامال کیا جا رہا ہے، اس کا ہم مؤثر نوٹس لیں۔

جناب چیئرمین! جہاں تک محترم وزیر اطلاعات (ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان) کا تعلق ہے میں ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں، یہ وزیر اعظم صاحب کا فرض تھا کہ وہ یہاں آتے اور ہم نے مطالبہ بھی یہی کیا تھا۔ پیر کو اس ایوان کی کارروائی کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے۔ لیکن ہمیں دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ وزیر اعظم صاحب نے فرانس جانے کو اہمیت دی جو اس وقت پاکستان کی تذلیل کر رہا ہے اور ہمارے چہرے پر طمانچے مار رہا ہے۔ تاہم اس ایوان میں آکر انہوں نے پاکستان کے دفاع اور پاکستان کو جو اہم ترین چیلنج تھا اس کے بارے میں سینیٹ کی رائے لینا اور سینیٹ کی تائید سے کوئی موقف اختیار کرنے کا ارادہ نہیں کیا، اس کی ہم مذمت کرتے ہیں۔

اصل مسئلہ کیا ہے؟

جناب والا! دوسرا پہلو اس وعظ سے متعلق ہے جو ہمیں یہاں سنایا گیا ہے۔ دہشت گردی کے بارے میں اور اسامہ بن لادن کے بارے میں کہ اس نے کیا کیا اور پھر بش اور مشرف نے کیا کیا اور اب کیا کر رہے ہیں، تاہم ہمارے خیال میں اس وقت وہ ساری باتیں غیر متعلق

ہیں۔ ہم اس بحث میں نہیں جائیں گے۔ دہشت گردی جس شکل میں بھی ہو وہ ایک جرم ہے اور اس کا مقابلہ ہونا چاہیے، یہ ریاست کرے یا کوئی فرد، گروہ یا پارٹی کرے۔ ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ۹/۱۱ اور اس کے بعد وہ افراد جن پر یہ الزام ہے کہ وہ اس دہشت گردی کے ذمہ دار تھے اور انہوں نے معصوم انسانوں کی جانوں کو ضائع کیا، اس سے ہزار گنا زیادہ جانی نقصان دہشت گردی کو ختم کرنے کے نام پر بش، مشرف اور نیٹو نے کیا ہے۔ انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جس کے نتیجے میں پوری دنیا دہشت گردی کی لپیٹ میں آگئی ہے اور نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔ یہ ۹/۱۱ سے بڑے مجرم ہیں اور یہ بات میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں جناب چیئرمین! آج دنیا کے تمام دانشور کہہ رہے ہیں۔ آپ مضامین اور کتابیں دیکھ لیجیے، صاف کہہ رہے ہیں کہ کون سا بڑا خطرہ ہے۔ لیکن میں اس وقت ۹/۱۱ کی بحث میں نہیں جانا چاہتا۔ جب موقع آئے گا، اس وقت ان شاء اللہ میں اس پر بات کر سکتا ہوں اور ماضی میں ہم نے اس پر بات کی بھی ہے۔

اس وقت مسئلہ کیا ہے؟ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت کو مطلع کیے بغیر اور پاکستان کی اجازت کے بغیر اور دونوں الفاظ فارن آفس کے بیان میں بھی ہیں اور ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان نے بھی ابھی اس ایوان کے سامنے پیش کیے ہیں، ہمارے خلاف فوجی حملہ ہوا ہے۔ کس کو پکڑنا تھا، کس کو نہیں پکڑنا تھا یہ علیحدہ بحث ہے لیکن یہاں میں فارن آفس کے بیان کے اس حصے کی پرزور مذمت کرتا ہوں جس میں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امریکہ نے اپنی اعلانیہ پالیسی کے مطابق کارروائی کی ہے۔ گویا ہم بالواسطہ اس کی توثیق کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ شرمناک بیان کسی قوم کی طرف سے نہیں آسکتا۔ اس کی شدید مذمت کرتے ہوئے میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟

میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کا یہ رویہ نیا نہیں ہے۔ امریکہ نے اس سے پہلے ہماری اجازت کے بغیر ۱۹۹۸ء میں افغانستان پر کروز میزائل پھینکے۔ اس وقت ہم خاموش رہے۔ ۹/۱۱ کے بعد مشرف کو آلہ کار بنا کر امریکہ نے ہمارے اڈے استعمال کیے۔

آلہ کار بنانے کی بات میں اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سلسلہ میں کوئی معاہدہ ہے یا نہیں، ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ تفصیلات ہمارے سامنے لائی جائیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ مشرف کا تعاون شامل تھا چنانچہ ہمارے اڈے اس کو فراہم کیے گئے۔

ان کی فوجیں یہاں رہیں اور ہماری سرزمین سے ۷۸ ہزار فوجی کارروائیاں افغانستان میں کی گئیں۔ پھر آپ کو یاد ہے کہ سرحدی دستوں کے بارے میں امریکی سولجرز سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہمارے علاقوں میں داخل ہوئے۔ آپ نے احتجاج کرتے ہوئے اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ [اس بار تو ہو گیا آئندہ] مثال نہ بنے لیکن وہ مثال بنا، کیوں؟ اس لیے کہ آپ نے اپنی زمین، اپنی آزادی، اپنی خود مختاری اور اپنے شہریوں کا دفاع نہیں کیا۔ چونکہ آپ نے یہ نہیں کیا، اس لیے امریکہ کو جرأت ہوئی اور امریکہ نے یہ اقدام کیا۔

میں ایبٹ آباد کے اس اقدام[1] کے بارے میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے علاقہ میں ایک دو نہیں، چار ہیلی کاپٹر آئے ہیں۔ یہ کوئی چڑیا نہیں تھی کہ آپ کو نظر نہ آئے۔ تقریباً پچاس منٹ ان کو آنے میں لگے ہیں۔ چالیس منٹ کا آپریشن ان کا دعویٰ ہے اور پچاس منٹ واپسی کے۔ جس کے معنی ہیں تقریباً اڑھائی گھنٹے، اس اڑھائی گھنٹے تک اگر آپ کی فوجیں سوتی رہیں، اگر آپ کی انٹیلی جنس کو اطلاع نہیں تھی، اگر آپ کی فضائیہ گراؤنڈڈ تھی تو سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ کہنا کہ وہ پہاڑوں کے بیچ میں سے نکل کر آ گئے، یہ ایک دھوکے کی بات ہے۔ دوسری جانب یہ کہنا کہ انہوں نے ہمارے نظام کو جامد کیا ہے تو یہ اس سے بھی بڑا مسئلہ ہے کہ آج انہوں نے اس حملہ کے لیے جامد کیا ہے، کل وہ آپ کے نیوکلیئر اثاثوں کو لے جانے کے لیے بھی آپ کے نظام کو جامد کر سکتے ہیں۔

ہمیں بتایا جائے کہ ہمارا دفاعی سسٹم کیا ہے؟ یہ قوم اپنا پیٹ کاٹ کر اس فوج کے لیے اربوں روپے ہر سال دے رہی ہے۔ ہر بجٹ میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ

---

[1] اشارہ ہے اسامہ بن لادن کی ہلاکت کے واقعہ کی جانب

دفاع مضبوط ہے، ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں تک ہمارے چیف آف آرمی سٹاف نے اسی اکیڈمی میں، جس کے پاس یہ واقعہ ہوا ہے، ایک ہفتے پہلے یہ بات کی ہے کہ ہم اپنی آزادی اور اپنی عزت و خوشحالی کو قربان نہیں کر سکتے۔ لیکن بد قسمتی سے وہ تو ہر روز قربان ہو رہی ہے۔ یہ کوئی دعوے کی بات نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے۔ جتنے ڈرون حملے ہو رہے ہیں، اس سے ہر روز ہماری خود مختاری کو پامال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے معصوم انسانوں کو مارا جا رہا ہے اور ہماری حکومت کا حال یہ ہے کہ وہ دوغلی پالیسی اور منافقت کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ اندر کچھ کہتی ہے، باہر کچھ کہتی ہے۔ شرم کی بات ہے کہ کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ قوم کے سامنے کوئی بات کرے لیکن صدر [زرداری] صاحب نے واشنگٹن پوسٹ میں مضمون لکھا اور کیا لکھا؟ معذرت دینے کے لیے۔ یہ کہنے کے لیے کہ حضور! جو کچھ آپ نے کیا ہے، ہم بھی آپ کے لیے دعا گو ہیں، اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہو سکتی ہے۔

اصل مسئلہ کیا ہے ؟ اصل میں یہ پاکستان کی خود مختاری کی خلاف ورزی ہے۔ یہ پاکستان کے خلاف ایک جنگی اقدام ہے۔ یہ ہماری سرزمین پر جارحیت ہے۔

کس کو مارا، کس کو نہیں مارا اور کس کو چھوڑ گئے، کس کو لے گئے ؟ غیر متعلق سوالات ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہماری خود مختاری اور ہماری سرحدوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور ہم ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کا منظر پیش کر رہے ہیں۔

انٹیلی جنس اداروں کی کارکردگی: مسئلہ کا دوسرا پہلو آپ کے انٹیلی جنس اداروں کا معاملہ ہے۔ اگر اسامہ بن لادن یہاں تھا اور آپ کو اس کی اطلاع نہیں تھی تو یہ آپ کی انتہا درجے کی ناکامی ہے۔ ایک طرف آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ دہشت گردوں کو پکڑ پکڑ کر دے رہے ہیں اور دوسری طرف آپ کے اپنے زیر سایہ، اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر کے اگر وہاں کچھ لوگ موجود تھے وہ آپ کی نظروں میں نہیں تھے۔ امریکہ نے جو کچھ کیا، وہ قابل مذمت ہے لیکن اگر آپ نے اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی تو وہ اس سے زیادہ قابل مذمت

اور قابل گرفت ہے۔ کسی کو اس غیر ذمہ داری اور لاپروائی کی سزا ملنی چاہیے ۔ جو بات وزیر اعظم اور ان کے ساتھی کہہ رہے ہیں اور آپ کے سفیر (حسین حقانی) نے واشنگٹن میں کہا ہے اسے چھوڑ دیجیے یہ دیکھیے کہ امریکہ اس پورے آپریشن کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے؟ اور وہ پوری گواہی پیش کر رہے ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ ناکامیاں ہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ دہشت گردی ہے یا نہیں ہے۔

غلطی کا اعتراف کیجیے: جناب والا! فوج اور انٹیلی جنس ادارے قوم کے سامنے جوابدہ ہیں۔ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ جو بھی حقائق ہیں، سامنے لائیے۔ اگر آپ سے غلطیاں ہوئی ہیں تو اس کا اعتراف کیجیے۔ جو ذمے دار ہیں، انہیں سزا دیجیے۔ جب تک ہم یہ اقدام نہیں کریں گے، یہ راستہ اختیار نہیں کریں گے، نہ ہمارا اعتبار بحال ہو گا نہ آپ کی موجودگی کا کوئی جواز ہو گا اور نہ ہم دستور کے مطابق اس ملک اور اس کے شہریوں کا دفاع کر سکیں گے۔ جناب والا! یہ ہے اصل مسئلہ، اور اگر اسے نظر انداز کیا جارہا ہے تو ہم اسے نظر انداز نہیں ہونے دیں گے۔ حکومتی بیان میری نگاہ میں بہانہ بازی ہے۔ بے ربط، متضاد، معذرت خواہانہ اور اس سے بڑھ کر شرمناک ہے۔ اس بیان کے معنی یہ ہیں کہ ہم اگر آج امریکہ کو یہ موقع دے رہے ہیں تو کل خدانخواستہ خدانخواستہ بھارت بھی یہی دعویٰ کرے گا۔ ان کے وزراء برملا کہہ رہے ہیں کہ اسی طرح ہمیں بھی حق ہے کہ جب چاہیں ہم پاکستانی سرحدوں کی خلاف ورزی کر دیں اور جس کو ہدف سمجھیں، اس کو باہر لے جائیں۔ یہ ہے مسئلہ کی اصل نوعیت۔

پارلیمنٹ کا قابل تحسین کردار: ساتھ ہی میں یہ بھی کہہ دوں کہ پارلیمنٹ کو زبانی تسلیاں بہت دی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پارلیمنٹ نے دھوکہ میں آئے بغیر اپنی ذمہ داری ادا کی ہے اور پوری ذمے داری سے ادا کی ہے۔ میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں میاں رضا ربانی کو اور قومی سلامتی پر پارلیمانی کمیٹی کو جس نے ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو متفقہ طور پر چودہ نکاتی

قرارداد[1] پاس کی اور جسے پھر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس نے بھی قبول کیا۔ اس میں صاف صاف یہ کہا گیا ہے کہ خارجہ پالیسی کو آزاد ہونا چاہیے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے طریقہ کار اور شرائط پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کچھ مشرف کے زمانے میں ہوا، وہ غلط ہے۔ سلامتی کا اصولی خاکہ ہمارا ہونا چاہیے، یہ کھل کر واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ مسائل کا کوئی حل فوجی نہیں ہے، سیاسی حل ہے۔ اس کے لیے مذاکرات، ترقی اور حفاظتی اقدامات ضروری ہیں۔ حفاظتی اقدامات اندھی فوجی کارروائی کا نام نہیں ہے، جو آج کی جارہی ہے۔ جس کے نتیجے میں ۳۰ ہزار افراد شہید ہوئے۔ ساتھ ہی اس میں یہ بھی کہا گیا کہ تمام وابستہ گروہوں کو اعتماد میں لیں تاکہ سب مل کر اس کا راستہ نکالیں۔

پھر اس کے بعد اپریل ۲۰۰۹ء میں، یعنی آج سے دو سال پہلے، اسی کمیٹی نے ۶۳ سفارشات دو اور دو چار کی طرح، حکومت کو پیش کیں جس میں واضح طور پر ڈرون کے مسئلے، دہشت گردی اور ہماری سرزمین کے دہشت گردوں کے لیے استعمال کو بھی لیا ہے۔ ہم نے کوئی یک طرفہ بات نہیں کہی ہے۔ ہم نے ہمیشہ پوری بات کہی ہے لیکن دکھ سے کہنا

---

[1] ۸ تا ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء منعقدہ ان کیمرہ اجلاس کے اختتام پر منظور ہونے والی اس ۱۴ نکاتی قرارداد میں قومی سلامتی کی حکمت عملی کا فوری جائزہ لینے اور آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنے پر زور دیتے ہوئے دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے تمام حقیقی اسٹیک ہولڈرز سے بات چیت اور تنازعات کے انتظام اور حل کے لیے مکالمہ کو حکمت عملی کی اولین ترجیح بنانے پر زور دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دہشت گردی کی تمام اقسام کی مذمت کرتے ہوئے پاکستان کی خود مختاری اور سالمیت کے خلاف متحد ہو کر کوشش کرنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا۔ یہ عزم بھی دہرایا گیا کہ پاکستان کا علاقہ دوسرے ممالک اور غیر ملکی جنگجوؤں پر کسی بھی طرح کے حملوں کے لیے استعمال نہ ہوگا۔ نیز شورش زدہ اور پسماندہ علاقوں اور بلوچستان کے حوالہ سے عوامی شکایات کے ازالہ اور صوبوں کے مابین منصفانہ طور پر وسائل کی تقسیم کے علاوہ آئین ۱۹۷۳ کی روشنی میں معاشرتی انصاف، مذہبی اقدار، قانون کی حکمرانی اور رواداری کے عمل کے ذریعہ فیڈریشن کو مضبوط بنانے پر زور دیا گیا۔

قرارداد میں انتشار زدہ علاقوں میں جرگہ کے ذریعہ رٹ قائم کرنے اور امن وامان کی ذمہ داریاں جلد از جلد سول اداروں کو منتقل کرنے، تشدد کے متاثرین کو معاوضہ ادا کرنے اور بے گھر ہو جانے والے لوگوں کی بحالی کے اقدامات کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ پارلیمنٹ کی ایک خصوصی کمیٹی کی تشکیل کے لیے مطالبہ کیا گیا جو مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں عمل درآمد کی نگرانی کرے۔

پڑتا ہے کہ دو سال ہو گئے ہیں، ہم مطالبہ کر رہے ہیں کہ آؤ، بتاؤ تم نے کیا کیا ہے۔ جو ابا فارن آفس سے ایک بیان آیا ہے، اس کے علاوہ ہمیں کوئی رپورٹ نہیں دی گئی۔ ہمارا فیصلہ تھا کہ ہر مہینے اس ۶۳ نکاتی پروگرام پر رپورٹ دی جائے گی۔ لیکن حکومت کی طرف سے اس ایک واقعے کے علاوہ کبھی رپورٹ نہیں دی گئی۔ ہم نے پہلے بھی احتجاج کیا ہے، آج بھی احتجاج کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ نے رہنمائی دی ہے، لیکن اس حکومت نے پارلیمنٹ کی رہنمائی کو ماننے سے انکار کیا ہے۔

حکمرانی کا جواز: حکومت جواز کھو چکی ہے، اس کا اعتبار باقی نہیں ہے۔ ایک جانب لیاقت و صلاحیت کم ہے اور دوسری جانب مفادات کی جنگ کی بناء پر حکمرانی کے مسائل ہیں۔ یہاں پاکستان کی خود مختاری پامال ہو رہی تھی اور ادھر آپ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے اراکین سے بطور وفاقی وزراء حلف لے رہے تھے، ان لوگوں سے جنہیں کل آپ لوٹا کہتے تھے، جن کو کل آپ گالیاں دے رہے تھے، جنہیں کل آپ قاتل کہتے تھے، آج آپ انہیں گلے لگا رہے ہیں تاکہ حکومت ٹوٹنے سے بچائی جا سکے۔ یہ ہے آپ کا کھیل۔ یہ سمجھوتے اور رعایتیں ہیں۔ یہ مفادات کا کھیل ہے۔ یہ ذاتی اقتدار اور ذاتی سہولتیں حاصل کرنے کا معاملہ ہے۔ قوم کو نظر انداز کیا ہوا ہے۔ یہاں آکر ہمیں درس دیتے ہیں کہ آؤ! قوم کی آزادی، اس کی خود مختاری اور اس کی عزت کی حفاظت کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں سب سے بڑا خطرہ آپ خود ہیں۔

میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس قوم نے فوج کو عزت دی اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا ہے لیکن ۲ مئی کا واقعہ فوج کی بہت بڑی ناکامی ہے۔ جس طرح ڈھاکہ کا سقوط ہوا، اسی طرح ایبٹ آباد پر حملہ فوج کی ناکامی ہے، یہ سیاسی قیادت کی ناکامی ہے اور قوم کو حق ہے کہ اس کا پورا پورا بدلہ لے اور احتساب کرے۔ عوام کی طرف ہمیں جانا پڑے گا، عوام اپنا حق حاصل کریں گے، پاکستان کی حفاظت کریں گے اور وہ لوگ جو آج برسر اقتدار ہیں اور جنہوں نے

پاکستان کی خود مختاری پر سودا کیا ہے، امریکہ کی ان خلاف ورزیوں پر جو خفیہ تعاون کار ہیں، ان سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔ ان شاء اللہ پاکستان زندہ ہے، زندہ رہے گا۔

(۴ مئی ۲۰۱۱ء)

امریکہ کے ساتھ تعاون
امن وامان کی صورت حال پر اثرات-۱، ۲

پاکستان میں امن وامان کی صورت حال یوں تو پہلے بھی بہت مثالی نہ تھی۔ تاہم امریکہ سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تعاون کے نتیجہ میں بالخصوص ۲۰۰۳ء میں تشدد اور دہشت گردی کے واقعات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے بڑے پیمانے پر تباہی پیدا کی۔ یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جس میں ایک جانب امریکی افواج اور ان کے ساتھ ساتھ پاکستانی فوج اندرون ملک 'دہشت گردی' کے خاتمہ کے لیے فوجی قوت کا بے دریغ استعمال کر رہے تھے اور دوسری جانب 'دہشت گرد' بھی اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ نتیجتاً دونوں اطراف کے جنگجوؤں کے ساتھ ساتھ بالخصوص قبائلی علاقوں میں ایسے متعدد واقعات ہوئے جن میں عام شہری آبادی بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ اس مجموعی تناظر میں زیر نظر دو ابواب میں سوال اٹھایا گیا ہے کہ دہشت گردی کے خاتمہ کی حکمت عملی اور پالیسی کی تشکیل میں کیا غلطیاں کی گئی ہیں اور اس کے نتیجہ میں کیا نقصانات ہوئے۔ نیز یہ کہ اب غلطیوں کو کس طرح درست کیا جائے۔

محترمہ چیئرپرسن! میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے فاٹا، سوات، باجوڑ اور ملک کے دوسرے علاقوں، بشمول بلوچستان، جہاں ایک اور انداز میں لیکن اسی طرح کی دہشت گردی ہو رہی ہے، کے سلسلے میں جو تحریک التواء میں نے تین دن پہلے پیش کی تھی، اس پر اپنے دلائل دینے کا موقع دیا۔ مجھ سے پہلے محترم مولانا گل نصیب اظہار خیال کر چکے ہیں اور میں پسند نہیں کرتا کہ ان چیزوں کو دہراؤں جو انہوں نے کہی ہیں۔ انہوں نے

واقعات اور حالات کا پس منظر اچھی طرح پیش کیا ہے، مجھے اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔

جناب چیئرپرسن! میں یہ کوشش کروں گا کہ اس مسئلے کو ذرا زیادہ تجزیاتی انداز میں پیش کروں اور پالیسی سازی کے لیے اس کے کیا نتائج و عواقب ہیں، ان کی طرف آپ کے توسط سے اس ایوان، حکومت اور پوری قوم کی توجہ مبذول کراؤں۔

دہشت گردی کے واقعات کا آغاز

جناب والا! میرے خیال میں جہاں تک دہشت گردی کے واقعات کا تعلق ہے گو ان کا سلسلہ نسب امریکہ میں ۹/۱۱ کے واقعہ تک پہنچتا ہے جو ۲۰۰۱ء میں ہوا تھا، لیکن پاکستان میں یہ سلسلہ عملاً ۲۰۰۳ء سے شروع ہوا ہے۔ میرے علم کے مطابق ۲۰۰۳ء تک ملک میں دہشت گردی کا کوئی واقعہ اس سلسلہ میں نہیں ہوا تھا۔ تاہم ۲۰۰۳ء سے لے کر، آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آگ لگی ہوئی ہے اور ہر روز دسیوں افراد شہید ہو رہے ہیں، ہمارے فوجی بھی، اور امریکی اور نیٹو افواج بھی دونوں گولے برسا رہے ہیں اور یوں کشت و خون کا ایک بازار گرم ہے۔ مجھے اس سلسلے میں جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں، اگر غارت گردی (ڈرون حملوں) کو شمار کریں تو ۹۰ سے زیادہ ہیں لیکن اگر گن شپ ہیلی کاپٹروں کی کارروائی اور فوجوں کا سرحد کراس کرنا شمار کیا جائے تو اس وقت تک ۵۴ واقعات ہو چکے ہیں۔ اس تعداد میں آج کی خبر شامل نہیں ہے۔ ۱۳۶ ایسے واقعات مشرف کے زمانے میں ہوئے اور اگر آج کے واقعہ کو شامل کر لیں تو ان چھ مہینوں میں ۱۹ واقعات ہوئے ہیں۔

جناب والا! اس دور میں یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے۔ اس کا سیاسی اور معاشی پہلو بھی ہے، اور سب سے بڑھ کر انسانی پہلو بھی ہے، ان تمام پہلوؤں کا ادراک بے حد ضروری ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہیں کہ اس وقت جو بحث ہمارے ملک میں اور ملک سے باہر ہو رہی ہے اس میں توجہ کا مرکز غلط ہے۔

دہشت گردی کے خلاف قوت کا استعمال

حکومت کی پالیسی سازی میں ایک چیز ہے کہ جسے دہشت گردی کہا جارہا ہے یعنی غیر ریاستی عناصر جو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے قوت کا استعمال کر رہے ہیں۔ دوسرا ہے دہشت گردی کا جواب جو بالعموم ریاست دے رہی ہے۔

اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ریاستی اقدام میں قوت کا استعمال بھی اگر کچھ خاص حدود سے باہر ہو جائے تو وہ بھی اسی طرح کی دہشت گردی قرار پائے گا جس طرح افراد یا گروہوں کی طرف سے غلط اور اشتعال انگیز قسم کے ذرائع کے استعمال کو دہشت گردی کہا جاتا ہے۔ اس لیے صورت حال کا دونوں پہلوؤں سے جائزہ لینا چاہیے کہ دہشت گردی میں کیا خرابی ہے اور دہشت گردی کے جواب میں کیا غلطیاں ہیں۔ اس وقت اصل مشکل یہ ہے کہ دہشت گردی کا نام لے کر اس کے جواب میں بھی دہشت گردی کی بدترین شکلوں کو اختیار کیا گیا ہے اور وہ دہشت گردی کے فروغ کا باعث ہوئی ہے۔ چنانچہ دہشت گردی ختم یا کم نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھی ہے۔ اس لیے دہشت گردی کے جواب کا بھی اس طرح تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے جس طرح کہ دہشت گردوں کی کارروائی اور ان کی غلط کاریاں اور اس کے نتیجہ میں آنے والی تباہی پر تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

جناب والا! دوسرے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معروف اصولوں کی روشنی میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ ان میں پہلا یہ ہے کہ قوت کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ اگر کسی صورت حال میں قوت کا استعمال جائز قرار دیا جائے تو اس پہلو سے ہر تشدد غلط نہیں ہے۔ چنانچہ جہاں آپ دستور، قانون اور سیاسی عمل کے مطابق تبدیلی کے مواقع ختم کر دیتے ہیں، جہاں قبضہ اور آپریشن ہو اور رد عمل اور اصلاح کا راستہ بند ہو تو وہاں اگر مجبوراً قوت کا استعمال کیا جائے تو اسے طاقت کا منصفانہ استعمال کہا جاتا ہے۔ درحقیقت منصفانہ جنگ کی پوری فلاسفی اسی بنیاد پر مبنی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر جنگ درست بھی ہو، اور اس کا مقصد صحیح بھی ہو تب بھی جو

طریقہ اختیار کیا جائے وہ درست اور متناسب ہونا چاہیے یعنی جنگ میں انصاف ہونا چاہیے۔ چنانچہ ایک جنگی انصاف ہے اور ایک جنگ میں انصاف ہے، یہ دو بنیادی اصول ہیں، خود اسلام نے ان اصولوں کو پیش کیا ہے اور اسلام اس کو مانتا ہے۔ اسلام نے جنگجو اور غیر جنگجو کے درمیان تفریق کی ہے اور یہ کہا ہے کہ قوت کا استعمال ضرورت کی حد تک کیا جائے اور جو بھی جنگ سے متعلق نہیں ہے اس کو ہدف نہیں بنانا چاہیے، اس پہلو سے ان تمام چیزوں کو دیکھنا بہت ضروری ہے جو موجودہ تصادم کے دوران کسی بھی فریق کی جانب سے ہو رہی ہیں۔ اس لیے کہ اصل مقصد تصادم کا خاتمہ ہے نہ کہ فریق مخالف کا خاتمہ اور اس کے لیے اصل ہدف ان اسباب کو دور کرنا ہے جن کی بنا پر تنازعہ رونما ہوتا ہے۔

حکومتی حکمت عملی کی غلطیاں

اب آپ دیکھیے کہ ہم نے کیا غلطیاں کی ہیں۔

دہشت گردی کی تعریف کیا ہے؟ ہم نے پہلی غلطی یہ کی ہے کہ دہشت گردی کے مفہوم کو صحیح طور پر متعین نہیں کیا۔ کیا چیز دہشت گردی ہے اور کیا نہیں ہے۔ حدود کا تعین کیے بغیر ہم ایک جنگ میں کود پڑے ہیں۔ دوسری جانب یہ جنگ بھی ہماری اپنی بنیاد پر شروع نہیں ہوئی۔ ۹/۱۱ کے کیا اسباب تھے اس پر کوئی توجہ نہیں ہے۔ امریکہ نے اس واقعہ کو کس طرح استعمال کیا، یہ ایک بڑی بحث ہے لیکن ہم نے بہرحال دہشت گردی کی تعریف اور دہشت گردی کی حدود کو متعین کیے بغیر ایک پالیسی بنا ڈالی۔ اس ضمن میں ایک اور بنیادی بات یہ ہے کہ ہم نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کو گڈمڈ کر دیا ہے۔

محترمہ چیئرپرسن! یہ بڑا بنیادی نکتہ ہے، اس لیے کہ جنرل مشرف صاحب بھی اور ہماری موجودہ حکومت اور ان کے ترجمان بھی ایک ہی سانس میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کی باتیں کرتے ہیں اور انہیں گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ دہشت گردی اس بات کا نام ہے کہ سیاسی مقاصد کے لیے شہریوں کے خلاف قوت کا استعمال کیا جائے۔ انتہا پسندی نظریات کا

معاملہ ہے، خیالات اور مؤقف کا معاملہ ہے اور اس میں اختلاف کی موجودگی کوئی غلط چیز نہیں ہے۔ ہر وہ معاشرہ جس میں غور و فکر کی آزادی ہو، اس میں اختلاف رائے کی اجازت ہوگی اور ہونی چاہیے۔ انتہا پسندی اس فکری بحث میں بالعموم ایک تہمت بن جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ کسی مسئلہ کی بہت مختصر اور بعض اوقات سطحی تشریح کرتے ہیں جبکہ کچھ اور لوگ گہرائی میں جاکر اور ٹھوس بنیادوں پر معاملات کو لے کر نکلتے ہیں اور یوں اختلاف بہت زیادہ بڑھ بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں ہماری تاریخ میں ہی نہیں، مغرب کی تاریخ میں بھی موجود ہیں لیکن انتہا پسندی اور دہشت گردی نہ ایک چیز ہے، نہ ہی یہ لازماً ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور نہ انتہا پسندی کی بنیاد پر دہشت گردی یا ریاستی دہشت گردی ہو سکتی ہے۔

رائے عامہ کیا کہتی ہے: یہاں اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ایک اہم مطالعہ 'Who Speaks for Islam' آپ کے علم میں لاؤں۔ یہ امریکہ کے مشہور دانشور پروفیسر جان ایسپوزیٹو (John Esposito) کی کتاب سے متعلق ہے جو ابھی چند مہینے پہلے آئی ہے۔ یہ کتاب ۹/۱۱ کے بعد سے جتنے گیلپ سروے ہوئے ہیں ان میں سے خاص طور پر اسلام اور مغرب اور دہشت گردی کے ذیل میں دریافت کیے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات کے تجزیوں پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں ایک پورا باب اس چیز پر ہے کہ انتہا پسندی کیا ہے؟ اور کیا چیز لوگوں کو انتہا پسند بناتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتہا پسندی اور اعتدال پسندی پر ان دنوں جو بحث چل رہی ہے اس میں بڑا کنفیوژن ہے۔

جناب والا! اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جن لوگوں کو انتہا پسند اور اعتدال پسند میں تقسیم کیا جارہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ انتہا پسندی کے الزام کو غیر سیاسی گالی کے طور پر اور دہشت گردی کی جنگ میں ایک جھوٹے الزام کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اوسطاً، سیاسی طور پر انتہا پسند، باقی لوگوں کی نسبت زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور اعداد و شمار کے مطابق سیاسی

انتہاپسندوں کا تقریباً ۶۷ فیصد ثانوی یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔

اسی طرح اس میں یہ بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے جو کہ بہت اہم ہے کہ عام شہریوں کو تشدد اور قوت کے ذریعہ ختم کرنے کے بارے میں رائے عامہ کیا کہتی ہے۔ اس جائزے میں یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ امریکہ میں کیے جانے والے گیلپ سروے کے مطابق صرف ۷ فی صد لوگوں نے یہ کہا کہ ہم عام شہریوں کو مار سکتے ہیں۔ جبکہ مسلمان دنیا کا جو سروے ہے وہاں یہ تعداد اور بھی کم یعنی محض ۲ فی صد اور ۳ فی صد ہے۔ ایسے میں جن کو بنیاد پرست کہہ کر ہدف بنایا جارہا ہے، یہ غلط طور پر پھیلائی گئی بات ہے۔ کم از کم الفاظ میں یہ غلط فہمی پر مبنی پالیسی ہے، حقائق پر اس کی بنیاد نہیں ہے۔

محترمہ چیئرپرسن صاحبہ! میں آپ سے یہ بھی کہوں گا کہ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو جسے آج انتہاپسندی کہا جارہا ہے کل وہ درمیانی پوزیشن بن جاتی اور پرسوں وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہیگل اور مارکس دونوں نے تاریخ انسانی کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ اس کو متفرق اجزاء سے پیدا ہونے والے نظام فکر کے عنوانات سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اینٹی تھیسس (Antithesis)اور تھیسس (Thesis)دونوں انتہائیں ہیں اور سِن تھیسس(Synthesis) ایک بیچ کی راہ ہے۔ آج کا جو اینٹی تھیسس ہے وہ کل تھیسس بن جاتا ہے۔ یہ سارا انسانی سفر ہے، اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ دوسری بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ دہشت گردی اور انتہاپسندی کے فرق کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ اس کو الجھا دیا گیا ہے اور اسے قوت کے استعمال کے جواز کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔

کیا دہشت گردی آج کا مسئلہ ہے؟

محترمہ چیئرپرسن! تیسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دہشت گردی آج کی چیز نہیں ہے، یہ ہمیشہ سے ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دہشت گردی کے سب سے پہلے منظم واقعات رومی سلطنت میں رونما ہوئے اور یہودی گروپ ہیر الڈز پہلا گروپ تھا جس نے منظم انداز میں یہ

کام کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں تین سو سال تک قاتلوں اور شدت پسندوں کا ایک طبقہ تھا جس نے اسے استعمال کیا ہے۔ اٹھارویں، انیسویں صدی میں انقلاب فرانس میں انتشار پسندوں نے دہشت گردی کو ایک سیاسی وسیلے کے طور پر استعمال کیا اور اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر کتنی ہی کتابیں اور بحث موجود ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن پوری تاریخ میں ۹/۱۱ سے پہلے تک دہشت گردی کو ایک جرم تصور کیا گیا ہے اور جرم ہونے کی صورت میں ہمیشہ اس کا مقابلہ انصاف مہیا کرنے کے نظام میں کیا گیا ہے۔

میں آپ کو مثال دوں گا۔ خود امریکہ میں ۲۰۰۱ء میں ۹/۱۱ کے واقعہ سے پہلے اسی ٹریڈ سنٹر پر ۱۹۹۳ء میں دہشت گردانہ حملہ ہوا ہے۔ اس حملہ میں ڈیڑھ سو افراد مارے گئے اور تین منزلیں متاثر ہوئیں لیکن جن پر حملہ کا الزام تھا انہیں عدالت میں لایا گیا اور عدالتی نظام کے تحت دہشت گردوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اسی طرح امریکی ریاست اوکلاہاما کا واقعہ [۱۹۔ اپریل ۱۹۹۵] ہے جہاں ایک سابق امریکی فوجی ٹموتھی میک ویگ (Timothy McVeigh) نے حملہ کیا جس میں ۱۶۸۔ افراد مارے گئے۔ لیکن حملہ آور پر مقدمہ چلایا گیا اور مروجہ عدالتی نظام کے تحت معاملہ کیا گیا۔ حتٰی کہ ۱۲۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو امریکی بحری جہاز یو ایس ایس کول (USS Cole) پر حملہ کرنے والوں کو بھی عدالتی نظام کے تحت سزا ہوئی جس میں سترہ افراد مارے گئے تھے۔

ان سب کے برعکس ۹/۱۱ کے معاملہ میں جو کچھ ہوا ہے وہ یہ کہ آنکھیں بند کر کے انصاف کے مثالیے کو تبدیل کر کے جنگی مثالیے (پیراڈائم) میں بدل دیا اور دہشت گردی جو ایک جرم ہے اس کے خلاف نام نہاد جنگ شروع کر دی گئی۔ ہم مانتے ہیں کہ دہشت گردی جرم ہے اور جو اس کے مرتکب ہوں اگر انہوں نے قانون اور حدود کی پاسداری نہیں کی ہے تو انہیں سزا ملنی چاہیے لیکن عدل کے تقاضے پورے کرنے کے بعد۔ لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ دہشت گردی کو جرم کی بجائے جنگ قرار دے دیا گیا۔ اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر جنگ کے سارے ضابطے اور قواعد کو بھی نظر انداز کر کے تباہی مچا دی گئی ہے۔ یہ بات کہ جس نے

جرم کیا ہے، مبینہ طور پر جس ملک میں وہ پائے جاتے ہیں وہ ملک ختم کر دیا گیا۔ افغانستان پر حملہ کے بعد عراق پر حملہ کر دیا گیا اور آج پاکستان پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ یہ سب اسی جنگی مثالیے کی بنا پر ہیں، یہ بنیادی غلطی ہے۔

اسباب کیا ہیں؟

جناب والا ! چوتھی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی بلاشبہ ایک قابل مذمت چیز ہے۔ لیکن سب مانتے ہیں کہ دہشت گردی کا خاتمہ محض قوت کے استعمال سے نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں کبھی بھی نہیں ہوا۔ اندھی قوت کے استعمال سے دہشت گردی میں اضافہ ہوا ہے کمی نہیں ہوئی۔ اس کا حل اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایک طرف جو قانون کی خلاف ورزی کریں ان پر گرفت کی جائے لیکن دوسری جانب ان اسباب پر توجہ دی جائے جو اس کی وجہ بنتے ہیں۔

اسباب میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ کچھ اسباب معاشی یا سیاسی صورت حال اور کچھ وقتی حالت کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جبکہ بعض کا تعلق پالیسیوں سے ہوتا ہے۔ اور میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ آج دنیا میں امریکہ کے خلاف جو نفرت ہے، اور جس کی بناء پر اس کے خلاف قوت کا بھی استعمال کیا جا رہا ہے اس میں بہت بڑا دخل امریکہ اور اس کے ساتھیوں کی آمرانہ اور سامراجی پالیسیاں ہیں، جو وہ بالخصوص مسلمانوں کے مفادات کے خلاف جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے معاملات کو جس طرح انہوں نے حل کیا ہے اس سے ان کے خلاف نفرت کا لاوہ پک رہا ہے۔ جب تک نفرت پیدا کرنے اور بڑھانے والے ان اسباب کا علاج نہیں کیا جائے گا دہشت گردی کے مسئلے کے بارے میں کوئی صحیح حکمت عملی نہیں بنائی جا سکتی۔

میں آپ سے خاص طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے میرے پاس دستاویزات بھی موجود ہیں کہ صدر بش نے ۲۰۰۲ء اور پھر ۲۰۰۶ء میں پالیسی بیانات میں

خاص طور پر اور کھل کر کہا ہے کہ ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ امریکہ مخالف روش بڑھنے کی وجہ ہماری پالیسیاں ہیں۔ جبکہ دوسری جانب ساری دنیا یہ پکار رہی ہے کہ اس کی ذمہ دار آپ [امریکہ] کی پالیسیاں ہیں۔ اس ضمن میں جریدہ فارن افیئرز میں شائع ہونے والے دو بڑے اہم مضامین قابل توجہ ہیں۔ پہلا مضمون 'اگلا صدر: مشکوک ایجنڈے کا ماہر' اور دوسرا مضمون 'ایک مستحکم عراق کیسے؟' پہلا مضمون امریکی حکومت کے ایک سابق مشیر رچرڈ ہالبروک (Richard Hallbrook) اور دوسرا مضمون تین سینئر پروفیسرز، سٹیفن بڈل (Stephen Biddle)، میخائل ای اوہنلون (Michael E. O'Hanlon) اور کینتھ ایم پولاک (Kenneth M. Pollack) نے تحریر کیا ہے۔ ان مضامین میں جو بڑی اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ ان سب لکھنے والوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عراق اور افغانستان میں ہماری [امریکی] حکمت عملی ناکام ہو چکی ہے اور زور دیا ہے کہ جب تک آپ دہشت گردی کے اسباب کی طرف نہیں جائیں گے اس وقت تک اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ دہشت گردی کا مقابلہ کیا جا سکے۔

تعاون کی شرائط کی حقیقت کیا ہے؟

جناب والا! پانچویں جو بنیادی غلطی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹/۱۱ کے فوری بعد، پاکستان کے مفادات اور قومی مقاصد کو نظر انداز کرتے ہوئے اس وقت کی قیادت نے جو ایک فوجی قیادت تھی، جس پر عملاً کوئی قدغن اور پابندی نہیں تھی، نہ ہی وہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتی تھی اس نے محض ایک ٹیلیفون کی بنیاد پر، بیرونی دباؤ میں ایک اتنا بڑا فیصلہ کیا جس نے حالات کا رخ بالکل بدل دیا۔ آج جو کچھ ہمارے علاقوں میں ہو رہا ہے، وہ اس فیصلے اور فیصلہ کی تنفیذ میں ہونے والی ہمالیائی غلطی کا ہی شاخسانہ ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ میں اس کی تفصیل میں جاؤں لیکن پالیسی کا یہ یوٹرن میری نگاہ میں حالات کو بگاڑنے اور اس مقام تک پہنچانے کا اصل ذمہ دار ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس وقت مشرف صاحب نے یہ اعلان کیا کہ وہ امریکہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس وقت انہوں نے چار باتیں کی تھیں۔ پہلی بات یہ کہ افغانستان میں جو ایکشن ہے ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ بہت ہی مختصر ہو گا اور مقصد صرف اسامہ بن لادن کو پکڑنا اور اسے عدالت کے سامنے لانا ہے۔ جناب والا! اصل مقصد اسامہ بن لادن نہیں تھا اور نہ ہے۔ نہ ہی ملا عمر تھا اور نہ آج وہ ہے وہ دونوں آج بھی موجود ہیں۔ اصل مقصد افغانستان میں اپنی فوجوں کا اتارنا اور وسط ایشیا، چین، پاکستان ان سب پر اپنا ہوّا بٹھانا ہے۔ دوسرا انہوں نے فرمایا تھا کہ ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ پاکستان کے مفادات متاثر نہیں ہوں گے۔ لیکن افغانستان میں شمالی اتحاد کو اختیار دیا گیا۔ اور یوں غیر پشتون اور پشتون کی کشمکش کو جنم دیا گیا۔ شمالی اتحاد کے جس نوعیت کے تعلقات بھارت سے تھے اس کی روشنی میں انہوں نے کھل کر ہمارے خلاف ایک خاص کردار ادا کیا اور ہماری اس وقت تک کی پوری پالیسی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

تیسری بات یہ کہی گئی تھی کہ ہمارے (ایٹمی) اثاثے محفوظ رہیں گے۔ جناب والا! لیکن آج ان پر جو خطرات منڈلا رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں اور جہاں تک یہ کہا گیا کہ کشمیر کے معاملے میں ہمیں کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا یہ بھی صریحاً جھوٹ ثابت ہوا ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یوٹرن کے بعد ۵ فروری ۲۰۰۲ء کو جنرل مشرف نے مظفر آباد میں تقریر کی ہے اور اس میں کہا ہے کہ 'دہشت گردی' اور جدوجہدِ آزادی سے ہم نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا اصولی مؤقف کمزور ہوا ہے اور کشمیر میں جاری مزاحمت کی عظیم تحریک کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ پاکستان کشمیر کے مسئلہ میں ایک پارٹی ہے۔ چنانچہ ہمارے لیے محض اخلاقی تائید کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا سیاسی اور معاشی مستقبل بھی اس سے وابستہ ہے۔ عملاً ہم اس مؤقف سے دست کش ہو گئے۔ اس طرح مشرف صاحب نے جو چاروں باتیں کہی تھیں وہ غلط ثابت ہوئیں۔

نتائج کیا ہوئے

اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے نتائج کیا ہوئے۔ پہلے یہ ہوا کہ ہم ایک ایسی جنگ کا حصہ بن گئے جس کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ مشرف نے امریکہ کے ساتھ کیا معاہدے کیے ہیں جبکہ بیرونی میڈیا کھل کر یہ بات لکھ رہا ہے کہ مشرف اور بش کے درمیان خفیہ سمجھوتے ہوئے ہیں اور امریکہ جس طرح ہماری خود مختاری تک کو پامال کر رہا ہے اس کے پیچھے یہ اسباب موجود ہیں۔ وہ ہمارے کان کھینچتا ہے اور ہم یہاں اپنے لوگوں پر گولے برساتے ہیں۔ وہ ہمیں دھمکی دیتا ہے اور ہم اپنے لوگوں پر فوج کشی کرتے ہیں۔

قومی خود مختاری پر اثرات: جناب والا! اس مجموعی تناظر میں سب سے پہلی چیز ہماری خود مختاری کا تصور ہے۔ پالیسی کی تشکیل ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم اس پورے معاملے سے خود نہیں نمٹ رہے بلکہ ہمیں آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے جس کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا کہ دہشت گردی کے واقعات پاکستان میں اس سے پہلے بھی ہوئے ہیں۔ چاہے وہ مذہبی بنیادوں پر ہوں یا سیاسی، فرقہ وارانہ اور لسانی یا علاقائی بنیاد پر لیکن وہ تمام محدود تھے، متعین ایشوز پر تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سیاسی بصیرت کی ضرورت تھی اور ہم بار بار مطالبہ کر رہے تھے کہ سیاسی طرزِ عمل سے ان کو حل کیا جائے۔ لیکن ۹/۱۱ کے بعد جنرل مشرف نے جو قوت استعمال کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے یہ کسی بھی طرح ہمارے حق میں نہیں ہے، یہ پالیسی امریکہ کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ جسے کہا جا رہا ہے کہ 'یہ ہماری جنگ ہے' اس سے بڑا جھوٹ اور غلط بیانی نہیں ہو سکتی۔

دہشت گردی کے بڑھتے واقعات: جناب چیئرپرسن! میں یہ بھی کہوں گا کہ ہم نے اس پالیسی کے نتیجے میں دہشت گردی کو اپنی زمین پر آنے اور فروغ دینے کے مواقع فراہم کیے۔ میں دہشت گردی کے ہر واقعے کی مذمت کرتا ہوں لیکن سماجی حقیقت پسند ہونے کے ناطے

سے یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتا کہ آخر وہ اسباب کیا ہیں جن کی بنا پر دہشت گردی کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

اگر آپ گہرائی میں جا کر اندازہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ دہشت گردی اور تشدد کے مختلف واقعات میں پہلے دو سال تک اگر نشانہ بنایا گیا تو صرف امریکہ ، فرانس اور غیر ملکیوں کو بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد جب معاملہ آگے بڑھا ہے، تو پھر ہماری اپنی فوج اور ان حکومتی اداروں کو جو امریکہ کے شراکت دار کی حیثیت سے اس ملک میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ اس دہشت گردی کی ساری ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو اس پاکستان مخالف پالیسی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس پاکستان مخالف پالیسی کے ذمہ داران نے جو زیادتی کی ہے وہ قطعاً قابل معافی نہیں ہے۔ چنانچہ موجودہ صورت حال کے اصل ذمہ دار حکومت اور حکومتی ایجنسیاں، ان کا فوج کا استعمال اور حکومت کی سیاسی اور خارجہ پالیسیاں ہیں۔

دوست دشمن بن گئے: تیسرا نقصان جناب والا! اس سے یہ ہوا ہے کہ جو ہمارے دوست تھے وہ دشمن ہو گئے۔ فاٹا وہ علاقہ ہے جہاں سے قائداعظم نے برطانوی دور کے اصول اور فوجی موجودگی کو ختم کرتے ہوئے دشمنی کے ماحول کو ختم کیا اور اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ اس وقت سے لے کر ۲۰۰۴ء تک ان علاقوں میں پاکستان اور پاکستانی افواج کے خلاف میرے علم میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ آج بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان ہمارا ہدف نہیں ہے، پاکستان کے ہم دشمن نہیں لیکن اگر پاکستانی افواج ہمیں ماریں گی تو ہم جواب دیں گے۔ جناب والا! اس طرح جو ہمارے دوست تھے وہ ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے تصور اور شناخت اور پاکستان کی فوج کے تصور اور شناخت ان دونوں پر جو اثرات پڑے ہیں وہ تباہ کن ہیں۔ آپ ذرا خیال کیجیے کہ افغانستان میں امریکہ کی کل افواج ۱۷ ہزار ہیں۔ نیٹو افواج اب ۳۳/۳۴ ہزار کے قریب ہیں۔ لیکن ہم اس وقت ایک لاکھ بیس ہزار فوجی اپنے لوگوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ افغانستان میں امریکہ کے جو فوجی ہلاک ہوئے ہیں وہ ہمارے سپاہیوں کی ہلاکت سے کئی گنا کم ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کی روشنی میں یہ کہا جا رہا ہے

کہ ایک ہزار دو سو پاکستانی فوجی آفیسرز اور جوان ہلاک ہوئے ہیں اور تین ہزار سے زیادہ عوام، سویلین یا کچھ طالبان مارے گئے ہیں۔ پانچ لاکھ افراد اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے۔ بے حساب مالی نقصانات اس کے علاوہ ہیں۔

فوج کے مورال پر اثرات: جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اپنے عوام کے خلاف نہ صرف فوج کو قبائلی علاقوں میں استعمال کیا، اس سے آگے بڑھ کر یہی کام ہم نے بلوچستان میں بھی کیا ہے لیکن میڈم چیئرپرسن مجھے اجازت دیں کہ میں یہ بھی بتاؤں اور میں اس کا ذاتی گواہ ہوں کہ ہمارے فوجی، جن میں بریگیڈیئر کے درجے کے لوگ بھی ہیں، انہوں نے یہ کہا ہے کہ آپ لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ ہم کس اذیت سے گزر رہے ہیں، جب ہم اللہ اکبر کہتے ہیں، اور جواباً وہ بھی اللہ اکبر کہتے ہیں اور ہم ایک دوسرے کو مارتے ہیں، اس وقت ہم پر عجیب وغریب کیفیت گزرتی ہے۔ آپ نے فوج کو نفسیاتی طور پر پست حوصلہ کر دیا ہے اور اگر اجازت دی جائے تو میں یہاں تک کہوں کہ فوج نے اس علاقے میں جو بھی زمینی آپریشن کیا ہے، وہ ناکام رہا ہے۔

جناب والا! اس دوران تین بڑے بڑے آپریشنز ہوئے ہیں اور تینوں میں کسی میں سو، کسی میں دو سو اور ایک میں میرے خیال میں اڑھائی سو فوجی طالبان کے ہاتھوں محصور ہوئے اور ان کو ہتھیار ڈالنا پڑے۔ یہ ہماری فوجی صورتحال ہے۔ درحقیقت ہم زمینی جنگ ہار چکے ہیں۔ اسی لیے پھر ہم نے وہ راستہ اختیار کیا جو امریکہ نے کیا۔ یعنی زمینی جنگ کی بجائے آسمان سے 'ہیلی کاپٹروں' سے، حتّٰی کہ F-16 سے آپ نے تباہی مچائی۔ جناب والا! اگر آپ گہرائی میں جا کر دیکھیں تو اس سے فوج، فوج کے بارے میں تصورات، فوج کے رول اور کردار کو بہت بڑا داغ لگا ہے۔

فوج کے لیے مشکلات: اس کے ساتھ میں یہ بھی کہہ دوں کہ ہماری فوج کی تربیت، ایک خاص خطرے اور ایک خاص دشمن کے تناظر میں ہوئی ہے۔ فطری طور پر یہ تربیت ایک خاص طریقے پر ہوئی ہے۔ گوریلا وار اور اسی طرح داخلی سطح پر مسلح تنازعات یا سول وار میں

سے ہر ایک کا اپنا مزاج ہے، اس کے اپنے آداب اور اپنا طریقہ کار ہے۔ یہ فوج اس کے لیے تربیت یافتہ نہیں ہے۔ ہم نے فوج کو اس آگ میں جھونک دیا جس کی وہ متحمل نہیں تھی۔ یہ جناب والا! اس کا پانچواں نقصان ہوا ہے۔

حکومت اور عوام میں بڑھتے فاصلے: چھٹا نقصان جو میری نگاہ میں بہت زیادہ ہے وہ یہ ہے کہ عوام اور قوم کی سوچ اور حکومت کی پالیسی میں بڑا فاصلہ اور فرق ہے۔ میں وقت کی کمی کی بنا پر تفصیلات پیش نہیں کر رہا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پوری دنیا اور پاکستان کے رائے عامہ کے جائزے اس بات پر گواہ ہیں۔ پاکستان میں ۷۳ فی صد لوگوں نے امریکہ کی طرف سے کیے گئے سروے کے مطابق کہا ہے کہ دہشت گردوں کے نام پر جو جنگ کی جارہی ہے یہ غلط ہے، یہ نہیں ہونی چاہیے۔ جنرل مشرف کو امریکہ کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔ امریکہ کے مقاصد اور ہمارے مقاصد مختلف ہیں۔ یہی پوری دنیا کے مسلمانوں کے احساسات ہیں۔ میں آگے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ رائے عامہ کے بڑے جائزے بتا رہے ہیں کہ ۶۲ فی صد سے زیادہ لوگ امریکہ کی اس جنگ کو غلط سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل مسئلہ پالیسیاں ہیں اور انہیں تبدیل ہونا چاہیے۔ حتٰی کہ امریکہ کے بارے میں جو تازہ ترین سروے ہوا ہے اس میں ۵۳ فیصد امریکیوں نے بش کی اس پالیسی کے بارے میں کہا ہے کہ اسے بدلو۔ جناب والا! میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اس کے نتیجے کے طور پر عوام کی سوچ اور قوم کی سوچ، قوم کے مقاصد اور قوم کے اہداف، قوم کی ترجیحات اور حکومت کی ترجیحات میں بڑا فرق واقع ہوا ہے جو قومی نقطہ نظر سے بہت بڑا نقصان ہے۔

فتح کے امکانات: آخری بات جناب والا میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک ناقابل فتح جنگ ہے۔ جس چیز کو دہشت گردی کہا جاتا ہے وہ ایسا جرم ہے، جس کی کوئی سیاسی وجوہ اور اسباب ہوں، اس کو اس طرح جنگ سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ دہشت گردی کو ختم کرنے کے لیے ہر جگہ بالآخر بات چیت ہوئی ہے۔ دنیا بھر کے تجربات خواہ وہ زمبابوے سے متعلق ہوں یا کینیا اور ساؤتھ افریقہ، حتٰی کہ انگلستان سے متعلق ہوں ایسا ہی ہوا ہے۔ میرے پاس وہ تمام

مواد موجود ہے جس میں کتنے ہی لوگ یہ بات کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک زبردستی کی جنگ ہے تو آپ سوچیے کہ ایک زبردستی تھوپی جانے والی جنگ سے آپ کیا حاصل کریں گے ؟

نئی حکومت کی غلطیاں

جناب والا! اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ میں مختصراً یہ آپ کو بتاؤں کہ میری نگاہ میں جہاں ماضی قریب کی یہ غلطیاں رہی ہیں وہاں موجودہ حکومت کی غلطی کیا ہے ؟

عوامی مینڈیٹ کا عدم احترام: موجودہ حکومت کی پہلی غلطی یہ ہے کہ اس نے سابقہ پالیسی کو جاری رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ عوام نے اس معاملے میں اپنی رائے کا واضح اظہار کیا ہے۔ ۱۸ فروری کے مینڈیٹ میں یہ بات شامل تھی کہ امریکہ کے ساتھ تعاون اور خارجہ پالیسی کا وہ رنگ جسے مشرف نے قائم کیا اور دہشت گردی کے نام پر جو جنگ اس نے اپنی قوم پر مسلط کی ہے اسے بدلا جائے۔ مجھے شبہ ہے اور اس سلسلے میں میرے پاس ثبوت موجود ہیں کہ یہ تبدیلی بھی ایک معاہدے کے ذریعے ہوئی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی کتاب کے اندر بھی اس کے اشارے موجود ہیں، تفصیلات نہیں ہیں۔ لیکن جو چیزیں پریس میں آئی ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ نے ان (بے نظیر بھٹو) کی وطن واپسی میں ایک کردار ادا کیا ہے۔ دوسری جانب سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات UAE بھی سرگرم رہے ہیں۔ ایک جانب مشرف صاحب اور دوسری جانب زرداری صاحب اس میں پارٹی تھے۔ یہ سارے کے سارے معاملات کس طرح طے ہوئے ہیں اور اندر معاملہ کیا ہے ؟ اور کیا موجودہ حکومت، جو کام مشرف سے امریکہ لے رہا تھا اسی کام کو سرانجام دینے کے لیے لائی گئی ہے، یہ تمام باتیں سیاسی بحث اور مطالعے اور تجزیے کے لیے ضروری ہیں۔ ان کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ لیکن ہم نے پہلے بھی بات کی ہے کہ اس پالیسی کا جاری رہنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اور اس کا جاری رہنا ان شبہات کو جنم دے رہا ہے کہ جمہوری عمل محض ایک ڈرامہ ہے اور یہ کسی پس پردہ معاہدے کا مظہر ہے۔

مشاورت اور مذاکرات پر عدم توجہ: جناب والا! میں یہ بات کرنا چاہتا ہوں کہ مشاورت کے ذریعے سے، پارلیمنٹ، تمام سیاسی جماعتوں اور دیگر متعلقہ لوگوں کو اعتماد میں لے کر، بلکہ میں تو یہ بات بھی کہتا ہوں کہ جو لوگ تشدد کر رہے ہیں ان کو بھی اعتماد میں لے کر فریقین کے درمیان بات چیت کی ضرورت ہے۔ یہ بات صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جو ہمارے وزیر اعظم اور بعض دوسرے لوگوں نے کہا کہ ہم بات نہیں کریں گے جب تک کہ ہتھیار پھینک نہ دیے جائیں، اس سے بڑی سیاسی غلطی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جب دو فوجوں یا دو ملکوں کے درمیان جنگ ہو رہی ہو، اس وقت بھی جنگ بندی سے پہلے ہتھیار نہیں ڈالے جاتے۔ آئرش ریپبلکن آرمی کے معاملے کو آپ دیکھ لیجیے گُڈ فرائیڈے ایگریمنٹ Good Friday Agreement کو طے ہوئے آج ۱۶ سال ہو گئے ہیں لیکن آئی آر اے کی کارروائیوں کا خاتمہ آج تک نہیں ہوا ہے۔ بلاشبہ ہتھیار کا پھینکنا جنگ کے اختتام کا ایک حصہ ہوتا ہے، لیکن اس کا ایک وقت ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ پہلے سے ہتھیار پھینک دو، اس کے بغیر ہم بات نہیں کریں گے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک سیاسی غلطی ہے۔

سیاسی زبان کے بجائے انتقام کی زبان: جناب چیئرپرسن! میں بتانا چاہتا ہوں کہ حکومت کی طرف سے جو زبان ہم استعمال کر رہے ہیں، وہ اصلاح کی نہیں ہے، وہ انتقام اور جنگ کو فروغ دینے کی ہے اور وہ زبان ہے جو امریکی صدر بش نے استعمال کی ہے۔ رحمٰن ملک صاحب کا یہ فرمانا کہ: اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر دوسری جانب سے ہم پر فائر ہو گا تو ہم رد عمل نہیں دیں گے، اگر ہم پر ایک مرتبہ گولی برسائی جائے گی تو ہم نو مرتبہ اس کا جواب دیں گے اور ہم اس امر کو یقینی بنائیں گے کہ یہ سلسلہ ایسے ہی رہے، مسئلہ کے حل کے لیے کسی سیاسی عمل کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

جناب چیئرپرسن! یہ جو ذہن ہے، یہ سیاسی ذہن نہیں، یہ مصالحت کا ذہن نہیں، یہ معاملات کو حل کرنے والا ذہن نہیں ہے۔ یہ آگ پر تیل ڈالنے والا ذہن ہے اور بدقسمتی سے یہی چیز حکومت کر رہی ہے۔

سہ شاخہ پالیسی کا عدم توازن: جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وزیر خارجہ اور وزیر اعظم نے بھی دو بار سہ نکاتی پالیسی مذاکرات، ترقی، ردجارحیت (Dialogue, Development, Deterrence) کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملاً صرف یکطرفہ جنگ ہو رہی ہے اور وہ اسلحہ اور قوت کی جنگ ہے۔ اگر آپ قوت کی جنگ لڑیں گے تو قوت اس کا مقابلہ کرے گی لیکن اگر بات چیت اور افہام و تفہیم کا دروزاہ کھولیں گے تو پھر قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تین شاخہ پروگرام کے تحت وہاں کے معاشی، تعلیمی، سماجی، سیاسی مسائل حل کر کے اور جو مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کو حل کر کے وہاں ہم جنگ بند کریں اور اس طرح یہ تینوں راستے جب تک اختیار نہیں کریں گے، امن کا راستہ نہیں نکلے گا۔

امریکہ سے تعاون جاری رکھنے کی پالیسی: جناب والا! اگلا نکتہ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ امریکہ سے تعلق اور خارجہ پالیسی کے موجودہ رخ پر انحصار کرنے سے گریز کیا جائے۔ جب تک آپ یہ نہیں کرتے کوئی پائیدار حل نکالنا ممکن نہ ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ کل سینیٹ نے ایک بڑا اہم کام کیا ہے، جس کا پریس نے نوٹس نہیں لیا۔ یہ سینیٹ کی قرارداد سے متعلق ہے۔ قومی اسمبلی کی قرارداد کے مقابلے میں سینیٹ کی قرارداد میں دونوں باتیں بہت اچھے انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ جو حالات ہیں، یہ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ پالیسی پر نظر ثانی ہو۔ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم دوسروں کی دہشت گردی پر نہ جائیں بلکہ وہ دہشت گردی جو ہمارے شہریوں اور ہمارے قومی مفاد پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ ہمارا مسئلہ ہے۔ باقی مسئلہ امریکہ کا ہے، وہ اپنی حماقتوں کے نتائج بھگتے، بھگت رہا ہے اور بھگتے گا۔ آپ دیکھیے کہ بش تاریخ میں امریکہ کے ناکام ترین صدر کے طور پر شمار کیا جا رہا ہے۔

کیا کیا جائے؟

جناب چیئرپرسن! آخر میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے واقعات پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے جو آپ سب کے سامنے ہیں، اسباب، بین الاقوامی پس منظر، مشرف کے دور کی غلطیوں اور اس دور کی غلطیوں کے اوپر توجہ مرکوز کی ہے۔ اس کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ

ہے کہ جس طرح قائد ایوانLeader of the House نے کھلے دل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کا دروازہ کھولا ہے، اسے آگے بڑھائیں۔ مذاکرات، مشاورت سب مل کر کریں، ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے نقطہ نظر میں فرق بھی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ خود آل پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (APDM) کی پارٹیوں کے درمیان بھی فرق ہو، ہمیں اس سے متوحش نہیں ہونا چاہیے۔ سیاست میں فرق اور اختلاف ہوتا ہے لیکن آیئے بیٹھ کر افہام و تفہیم کے ذریعے راستہ نکالیں۔ میں ایک بار پھر صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جنگجوئی کا مقابلہ اگر فوجی طاقت اور دہشت گردی کا مقابلہ ریاستی دہشت گردی سے آپ نے کیا تو یہ دہشت گردی کو فروغ دینے کی ترکیب ہے، اس سے دہشت گردی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ ہوش کے ناخن لیجیے، دوبارہ سوچیے، پالیسی پر نظر ثانی کیجیے، اسباب میں جایئے، جو وجوہ ہیں ان کو ٹھیک کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دوبارہ امن، آشتی اور سلامتی کے ساتھ بقائے باہمی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ (۵ ستمبر ۲۰۰۸ء)

-۲-

جناب چیئرمین! امن و امان کے مسئلہ پر ہم دو دن سے اس ایوان میں بحث کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میں ان چیزوں کا اعادہ کروں جو میرے معزز بھائیوں اور بہنوں نے اس ایوان میں پہلے ہی پیش کر دی ہیں۔ البتہ صرف حقائق کو تازہ کرنے کے لیے یہ بات کہوں گا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نتیجے کے طور پر بدامنی، لاقانونیت اور معصوم انسانوں کا جو کشت و خون نو سال سے ہو رہا ہے، یہ ایسا عظیم سانحہ ہے جسے ایک لمحے کے لیے بھی جاری رکھنا میری نگاہ میں ایک جرم ہے۔ اس لیے میں پہلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں دہشت گردی کے خلاف جنگ کی دلدل سے نکلنے کی عملی کوشش کرنی چاہیے۔

عالمی حالات بدل رہے ہیں۔ حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دہشت گردی بلاشبہ ایک جرم اور انسانیت کے خلاف ایک نوعیت کی جنگ ہے لیکن اسے ختم کرنے کے لیے جو

راستہ اختیار کیا گیا ہے، اس سے یہ ختم نہیں ہوئی، بلکہ کہیں زیادہ بڑھی اور پھیلی ہے اور اس سے زیادہ دہشت گرد پیدا ہوئے ہیں کیونکہ بے اطمینانی اور عدم تحفظ بڑھا ہوا ہے۔ میں یہ بات کہوں گا کہ جس طرح پارلیمنٹ نے اپنے مشترکہ اجلاس میں ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو حالات کا تجزیہ کر کے ۱۳ نکات کا ایک پروگرام دیا تھا اور پارلیمنٹ کی قومی سلامتی کی کمیٹی نے اکتوبر ۲۰۰۸ء میں ایک تفصیلی روڈ میپ دیا تھا، اس پر کوئی عمل نہیں ہو رہا ہے۔ یہ پارلیمنٹ کی توہین ہے اور یہ ملک کے مسائل سے اغماض، غفلت اور مسائل کو گھمبیر بنانے اور پیچیدہ بنانے کا راستہ ہے۔ خدا کے لیے اس معاملے میں ہوش کے ناخن لیں، حقائق کو تسلیم کریں اور معاملات سے نمٹنے کے لیے صحیح حکمت عملی اور پروگرام بنائیں۔ محض چیزوں کو ٹال کر اور ایک دوسرے پر الزام لگا کر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

کراچی کی صورت حال: جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کراچی کا مسئلہ بڑا اہم ہے اور آپ کو یاد ہو گا کہ اس معزز ایوان میں دو معزز پارٹیوں کے نمائندوں نے ایک دوسرے کے خلاف بات کرتے ہوئے جو حقائق پیش کیے ہیں، وہ حقائق ناقابل انکار ہیں۔ اس لیے کہ ایم کیو ایم، اے این پی اور پی پی پی تینوں کے لوگ اور ان کے ساتھ بہت سے معصوم انسان بھی مارے گئے ہیں۔ جماعت اسلامی کے لوگ بھی مارے گئے ہیں۔ اگر اخباری اطلاع صحیح ہے تو صدر محترم نے اپنی حالیہ میٹنگ کے دوران یہ بات کی ہے کہ پی پی پی کے سو افراد کو ایم کیو ایم نے مارا ہے۔

وزیر داخلہ موجود ہیں۔ وہ بیچارے بہت بھاگ دوڑ کر رہے ہیں لیکن ہر واقعے کے بعد ان کا بیان آتا ہے کہ دہشت گردی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جو کچھ ہو رہا ہے، وہ آپ کی اجازت سے ہو رہا ہے؟ اور آپ کے تمام بیانات کے باوجود یہ معاملات آخر کیوں ہو رہے ہیں؟ اور یہ کیا پراسراریت ہے کہ ٹارگٹ کلنگ ہوتی ہے، کبھی دس، کبھی بارہ، کبھی پندرہ، کبھی چالیس، کبھی پچاس لوگوں کی ہلاکت ہو جاتی ہے۔ پھر آپ جاتے ہیں، گورنر ہاؤس میں ایک میٹنگ ہوتی ہے، اس وقت ٹارگٹ کلنگ رک جاتی ہے۔ پھر

شروع ہو جاتی ہے۔ پھر پچھلا سارا عمل دہرایا جاتا ہے۔ آخر یہ ہم کب تک دہرایا کریں گے ؟ ہم کب اس دلدل سے نکلیں گے ؟اس لیے کراچی کے مسئلے کے سلسلے میں، خاص طور پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس سے نمٹنے کے لیے جامع حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ اور جو لوگ بھی اس قتل وغارت کے ذمہ دار ہیں انہیں کٹہرے میں لانے کی ضرورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں لیکن ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جارہا کیونکہ وہ حکومتوں میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں جہاں سے ان کی پشت پناہی کی جارہی ہے۔ جب تک آپ ان کے خلاف اقدام نہیں کریں گے، امن قائم نہیں ہو گا۔

ملک میں بڑھتی لاقانونیت: پھر ملک میں بحیثیت مجموعی جو لاقانونیت ہے، قانون کو ہاتھ میں لیا جاتا ہے اور دن دھاڑے تشدد ہوتا ہے اس پر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ درحقیقت جس معاشرے میں قانون کا احترام نہ ہو، جہاں قانون کے محافظوں کی موجودگی میں اور ان کے سامنے لوگوں کو قتل کیا جارہا ہو اور پولیس اور امن وامان کے دیگر ادارے اس میں ملوث ہوں تو سوچنا چاہیے کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟ یہ کوئی ایک دو مقامات اور واقعات کی بات نہیں ہے، تقریباً دیگر سارے شہروں میں بھی یہی کیفیت ہے۔

جناب چیئرمین! میری نگاہ میں یہ بڑا بنیادی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق محض حکومت، اپوزیشن یا سیاسی پارٹیوں سے نہیں ہے بلکہ پوری سوسائٹی پر اس کے اثرات ہیں۔ جس تیزی سے تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے اور ہر طبقے میں عصبیت کی بنیاد پر بڑھ رہا ہے، اس میں قومیتیں بھی ہیں، مسالک کا معاملہ بھی ہے اور سیاسی اختلافات بھی ہیں ان کو جس رخ پر آگے بڑھایا جارہا ہے، بلاشبہ یہ کسی بھی معاشرے کے لیے بڑا خطرناک ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھنا ہو گا اور ہر سطح پر اس بات کی کوشش کرنی ہو گی کہ معاشرے میں ایک دوسرے کا احترام، رواداری، اختلاف رائے کو برداشت کرنا سکھایا جائے اور بات چیت اور تعاون و اشتراک کے ذریعے سے مسائل کو حل کرنے کے رویوں کو پروان چڑھانے کی ہر سطح پر کوششیں کی جائیں۔ یہ ایک بڑا بنیادی مسئلہ ہے، میں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا

چاہتا ہوں اور ہماری امن و امان پر اس بحث سے یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ جب تک ہم دہشت گردی کے خلاف اس نام نہاد جنگ سے اپنا دامن نہیں چھڑاتے اور ساری توجہ اپنے مسائل، اپنی ترجیحات، اپنی قوم کی مصیبتیں، مسائل اور مشکلات کی طرف مبذول نہیں کرتے، ہم اس دلدل سے نہیں نکل سکتے۔

اس کے ساتھ ہی قومی سطح پر مذہبی فرقوں کے درمیان اور علاقائی یا دوسری بنیادوں پر اختلافی گروہوں یا تنظیموں کا معاملہ بھی ہے۔ اختلاف ایک فطری چیز ہے، اگر وہ اپنی حدود کے اندر رہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود یہ بات کہی ہے کہ ہم نے قومیں، شعوب اور قبائل بنائے ہیں، اس لیے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ لیکن اگر رواداری اور ایک دوسرے کا احترام باقی نہ رہے تو وہ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور اس کا استحکام اور سلامتی مشکل ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ عالمی اور ملکی سطح پر تعلیم اور میڈیا، ہر جگہ پر تشدد کو فروغ دینے کے بجائے ختم کرنے کی کوششیں ہونی چاہییں۔

منظم جرائم پیشہ گروہوں کی سرگرمیاں: جناب والا! اگلی بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ حقیقی مسائل ہیں۔ جن میں، لینڈ، ڈرگ مافیا، اغوا اور جرائم کے لیے بننے والے منظم گروہوں کی سرگرمیاں بھی شامل ہیں۔ جب تک ان مسائل کو سیاست سے الگ کر کے حل کرنے کی کوشش اور مؤثر کارروائی نہیں کی جاتی، یہ گروہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جائیں گے اور خدانخواستہ، جیسا کہ نظر آرہا ہے کہ ان کو سیاستدانوں کی حمایت بھی حاصل ہے تو پھر یہ مسئلہ اور زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے اس کو سیاسی قوتوں سے علیحدہ کیا جائے اور اس کے بعد ایک ایک مسئلے کو لے کر اس کی اصلاح کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اصلاح ناممکن نہیں ہے، دنیا میں قومیں اس سے زیادہ خراب حالات سے گزری ہیں اور انہوں نے ان مسائل کو حل کیا ہے۔ لیکن مجھے جس بات سے پریشانی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں ذمہ دار سطح پر نہ مسئلے کے گھمبیر ہونے کا احساس ہے، نہ صدق دل سے اس کے اسباب کو متعین کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور نہ ہی کوئی حکمت عملی بنائی جارہی ہے

تاکہ ہم اس کا سامنا کر سکیں۔ جناب چیئرمین! جب تک یہ تینوں کام نہیں ہوں گے تو میں نہیں سمجھتا کہ ہم اس دلدل، آگ اور مصیبت سے نکل سکیں گے۔

لاپتہ افراد کا مسئلہ: چوتھی بات لاپتہ افراد کا مسئلہ ہے، یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی دو، چار اور پانچ افراد کا مسئلہ ہے۔ جو معلومات میڈیا میں آئی ہیں، اس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چار ہزار سے ۱۰ ہزار کے درمیان افراد لاپتہ ہیں۔ جناب چیئرمین! میں اپنی ذاتی معلومات کے مطابق کہہ رہا ہوں کہ اسلام آباد میں پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے اغوا کیے گئے ہیں اور ان کے لواحقین کو، ایجنسی والوں نے کہا کہ تم کچھ نہ کرو، وہ آجائیں گے، اس کے بعد مہینے گزر گئے لیکن ان بچوں کا کوئی پتا نہیں چلا۔ یہ بڑا ہی خطرناک مسئلہ ہے، اگر آپ نے اس کا سدباب نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کسی کی بھی جان سلامت نہیں رہے گی۔ لاپتہ افراد کا مسئلہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے، اس پر بھی فوری گرفت کرنے کی ضرورت ہے۔[1]

قانون کے احترام کا فقدان: جناب والا! میں جو اگلی بات اس سلسلے میں کرنا چاہتا ہوں وہ قانون کے احترام کی بات ہے۔ اس وقت میری نگاہ میں ہمیں جو سب سے بنیادی مسئلہ

---

[1] لاپتہ افراد کے مسئلہ پر سینیٹ آف پاکستان میں پروفیسر خورشید احمد نے ۱۳ دسمبر ۲۰۱۱ کو بھی گفتگو کی اور پھر ۷ مارچ ۲۰۱۲ء کو درج ذیل متفقہ قرارداد بھی پیش کی:

سینیٹ آف پاکستان لاپتہ افراد کے مسئلے پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ ان واقعات سے آئین کے آرٹیکل ۹ اور ۱۰ کی مسلسل خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اگرچہ دہشت گردی یا بغاوت کی کارروائیاں ناقابل معافی ہیں لیکن قانون کی نگاہ میں ہر شہری قصوروار ثابت ہونے تک، معصوم ہے۔ کسی بھی انسان کا اغوا، بلاوجہ اٹھانا اور جبری گمشدگی ایک مہذب معاشرے میں غیر قانونی اور ناقابل برداشت ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس صورت حال کا سنجیدہ نوٹس لیا جس نے ملک خصوصاً بلوچستان، کراچی اور فاٹا میں خطرناک حدوں کو چھو لیا ہے۔ سینیٹ نے قرار دیا ہے کہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو ان لوگوں کے سوا جن پر ملکی قوانین کے تحت کسی بھی جرم میں ملوث ہونے کے الزامات عائد کیے گئے ہیں بقیہ تمام لاپتہ افراد کی جلد بازیابی اور رہائی کو یقینی بنانے کے لیے فوری اور مؤثر اقدامات کرنے چاہییں۔ سینیٹ یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اس سلسلہ میں ایک تفصیلی رپورٹ ایوان میں پیش کی جائے۔

درپیش ہے، اور وہ مسئلہ اوپر سے لے کر نیچے تک ہے، وہ یہی ہے کہ اگر ملک اور حکومت کے سربراہ، وزراء، جج، جرنیل، اراکین پارلیمنٹ اور بااثر افراد قانون کا احترام نہیں کریں گے تو قانون کا کہیں احترام نہیں ہو گا۔

میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ قائداعظم محمد علی جناح نے کتنی عظیم تحریک چلائی تھی لیکن یہ پوری تحریک قانون کی پاسداری کے ساتھ چلائی گئی۔ ان کا ذاتی کردار یہ تھا کہ انہوں کبھی بھی انتظامی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ریلوے کا پھاٹک بند تھا، ان کے لیے کھولنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے روک دیا کہ پھاٹک نہ کھولیں جو قانون ہے، میں اس کا احترام کروں گا۔ جنرل گل حسن نے اپنی کتاب میں دو واقعات دیے ہیں۔ ایک میں وہ کہتے ہیں کہ جب ۱۹۴۸ء میں کراچی میں فسادات ہوئے اور کرفیو لگا تو ایک موقع پر اس وقت کے وزیراعلیٰ سولجر بازار کے علاقے میں جارہے تھے۔ ان کو پولیس والوں نے روکا اور ان سے کہا کہ آپ پاس دکھائیں۔ جواب میں وزیراعلیٰ نے اپنا تعارف کرایا جس پر انہیں کہا گیا کہ ہم آپ کا احترام کرتے ہیں لیکن ہمیں جو ہدایات ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس کے پاس کرفیو کے دوران پاس نہ ہو، ہم اس کو چیک کریں۔ وزیراعلیٰ نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں، مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور میں آئندہ پاس لے کر آؤں گا۔ پھر وہی گل حسن بعد کے کسی وزیراعظم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ کار میں تھا، ڈرائیور نے لال بتی پر گاڑی روکنے کی کوشش کی تو وزیراعظم نے کہا کہ گاڑی نہ روکو مجھے کون روک سکتا ہے۔

جناب چیئرمین! ان دو واقعات میں قیادت کے طرز عمل کا فرق واضح ہے۔ اس معاملے میں جب تک قیادت مثال قائم نہیں کرے گی تب تک ملک میں قانون کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔ قانون کی گرفت کے معنی ڈنڈے کو استعمال کرنا نہیں ہے، قانون کی گرفت کے معنی یہ ہیں کہ سب قانون کا احترام کریں، یہ اصل چیز ہے۔ اسی کا دوسرا پہلو انصاف ہے جس معاشرے میں انصاف نہ ہو اور انصاف کا مسئلہ صرف اعلیٰ عدالتوں ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ نیچے سے لے کر اوپر تک انصاف نہ ہو تو وہاں حالات کی بہتری کا تصور

کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ بات کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ زیریں عدلیہ میں جو حالات ہیں، لوگ جس طرح در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، ان کا جس طرح وکلاء استحصال کرتے ہیں اور جس طرح ہر سطح پر رشوت کا بازار گرم ہے، نئی عدالتی پالیسی کے باوجود ان حوالوں سے حالات کسی بھی طرح قابو میں نہیں ہیں۔ بلاشبہ اعلیٰ عدالتوں، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ میں کچھ فرق واقع ہوا ہے، ہم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کو مانتے ہیں لیکن جب تک یہ عدالتی نظام میں نچلی سطح تک نہیں آئے گا اور سب کے ساتھ انصاف نہیں ہو گا، معاملہ سدھرے گا نہیں۔ نیب قانون کے تحت ایک وزیر کو غیر حاضری کی بناء پر سزا دی جاتی ہے، لیکن پھر اس کو معاف کر دیا گیا جبکہ ایک دوسرے سیاسی کارکن کو بعینہ اسی صورت میں اسی جرم کی بنا پر، اور اسی دفعہ کے تحت سزا دی جا رہی ہے۔ اگر آپ یہ تفریق کریں گے تو پھر معاشرہ نہیں چل سکے گا۔

اداروں کا عدم استحکام: اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ قانون کی حکمرانی اور انصاف کا حصول ہر صورت میں یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے ساتھ اداروں کا معاملہ ہے، خدا کے لیے اس معاشرے اور ملک کو بچانے کے لیے، اداروں کے استحکام اور اداروں کا اپنی اپنی حدود میں کام کرنا یقینی بنائیے۔ جس طرح ملک کی پولیس اور انتظامیہ کو تباہ کیا گیا ہے اور ان کو سیاسی مقاصد کے لیے ماضی کی طرح آج بھی استعمال کیا جا رہا ہے، وہ نظام کے لیے تباہ کن ہے۔ وزیر اعلیٰ اور اراکین اسمبلی کی دلچسپی ہوتی ہے کہ ایس ایچ او ان کا نامزد ہو، وہ ان کو اور ان کے لوگوں کو تحفظ دے، اس کو اپنے دوسرے کاموں کے لیے استعمال کیا جائے، اس چیز نے اداروں کو بری طرح تباہ کر دیا ہے۔ آپ آج اگر حقائق کا جائزہ لیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے جرائم پولیس کی سرپرستی اور پولیس والوں کی شمولیت سے ہو رہے ہیں۔ اور ان جرائم میں انہیں سیاسی لوگوں کا تحفظ حاصل ہے۔ اگر ہمیں اس صورت حال سے نکلنا ہے تو اداروں کو بچانا اور انتظامیہ کو انتظامیہ کے لیے، پولیس کو امن و امان قائم کرنے کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ ان کی خدمات سب کے لیے برابر ہوں۔ اداروں کا

غیر سیاسی کیا جانا بہت ضروری ہے۔

میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ قائد اعظم محمد علی جناح نے سول سرونٹس، پولیس اور مسلح افواج، تینوں کے نمائندوں کے سامنے واضح کہا ہے کہ تمہارا کام قانون کو نافذ کرنا اور قواعد کے مطابق فیصلے کرنا ہے، سیاستدانوں کے احکام اور ان کی آنکھوں کے اشاروں پر کام نہیں کرنا ہے، انہوں نے متنبہ کیا لیکن ہم نے ان سب اصولوں کو نظر انداز کیا ہے۔

بیرونی قوتوں کا کردار: جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ان تمام اسباب کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں بیرونی قوتوں کا کردار بھی ہے۔ میں اس سلسلے میں خصوصیت سے کہنا چاہتا ہوں کہ افغانستان اور انڈیا دونوں ہمارے خلاف اپنا اپنا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ میں یہ محض سنی سنائی کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امریکہ کے قابل اعتماد پریس کے تجزیئے کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ امریکی ایماء پر ان ملکوں کی ایجنسیاں پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ یہ ایجنسیاں حالات کو بگاڑنے، ملک میں تفریق پیدا کرنے، تصادم کی کیفیت پیدا کرنے، خون خرابہ کرنے اور حتّٰی کہ دہشت گردی کے واقعات کرانے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ابھی چار دن پہلے امریکہ کے اخبارات میں ایک امریکی صحافی کی رپورٹ آئی ہے جس میں اس نے نام لے کر بتایا ہے کہ کس طرح سی آئی اے اور دوسری ایجنسیاں پاکستان میں کام کر رہی ہیں اور ان کے ۳۰۰۰ سے زیادہ افراد اس وقت پاکستان میں سرگرم ہیں۔ ابھی جو نئے امریکی سفیر کیمرون منٹر (Cameron Munter) آرہے ہیں، ان کی سنوائی (Hearing) امریکہ کی کانگریس میں ہوئی ہے تو اس میں انہوں نے اور سینیٹر لوگر (Lugar) نے بھی کھل کر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پاکستان اور افغانستان دونوں میں آپریشنز ہو رہے ہیں، ہم ان تمام حقائق کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔

میرے ساتھیوں نے امن و امان کے مسئلے پر جن خفیہ اور کھلے واقعات کی نشاندہی کی ہے اور جو حقائق پیش کیے ہیں، ان کی تائید کرتے ہوئے، میں نے اپنی تمام توجہ کو اس پر مرکوز رکھا ہے کہ اس کے اسباب پر توجہ ہو اور نتیجتاً یہ واضح ہو سکے کہ اس سے نمٹنے کے لیے

کیسی حکمت عملی کی ضرورت ہے اور اس حکمت عملی کے کیا عناصر ہونے چاہییں، اگر آپ ان چیزوں کی فکر کریں گے تو ہی ملک اس دلدل سے نکلے گا۔

(۲۹ ستمبر ۲۰۱۰ء)

صدر پر حملہ اور ان کے سیکورٹی انتظامات

جناب چیئرمین! آج کا دن ہم سب کے لیے تشویش، پریشانی اور غور و فکر کا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کو جب صدر مشرف پر حملہ کا واقعہ ہوا تھا، میں نے اور میرے رفقاء نے اور پورے ایوان نے اس پر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ ہم نے اس حملہ کی بھرپور مذمت کی اور ملک کے لیے اسے ایک نہایت خطرناک رجحان قرار دیا۔ ہمیں بڑا دکھ ہے کہ اب گیارہ دن کے بعد، اسی علاقے میں، اس سے زیادہ سنگین نوعیت کا ایک اور واقعہ[1] رونما ہوا ہے۔ بلاشبہ ہم سب ایک زبان ہو کر اس کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ حملہ آوروں کا آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن یہ وقت اس بات پر غور کرنے کا ہے کہ ایسے واقعات کیوں رونما ہو رہے ہیں؟ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ہماری حکمت عملی کیا ہونی چاہیے اور یہ واقعات قوم کے پالیسی سازوں کو کیا پیغام دے رہے ہیں۔

میں اپنے ساتھیوں کی اس بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں کہ ہماری نگاہ میں یہ واقعہ سکیورٹی کی ذمہ داری میں ایک خطرناک غفلت ہے، اس پر پردہ ڈالنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو گا۔ بلاشبہ جنرل مشرف نے جس طرح جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کو یہی کرنا اور کہنا چاہیے لیکن ان کے یہ سب کچھ کہہ دینے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں

---

[1] بین الاقوامی نیوز چینل الجزیرہ (۲۵ دسمبر ۲۰۰۳ء) کے مطابق صدر جنرل مشرف ایک خودکش حملے میں بچ گئے۔ اس حملے میں کم از کم ۱۲ افراد ہلاک ہوئے جبکہ تین کاروں کو جن میں صدر مشرف کی کار بھی شامل ہے شدید نقصان پہنچا۔ اس حملے میں خودکش حملہ آوروں نے جو صدر کے راستے میں پٹرول پمپ پر موجود تھے دھماکہ خیز مواد کے ساتھ صدر جنرل مشرف کے قافلے پر چڑھائی کی لیکن صدر مشرف بچ گئے، اس سے دس دن قبل بھی اسی راستے پر صدر مشرف پر خودکش حملہ ہوا تھا اس میں بھی وہ بچ گئے تھے۔

اعتراف کرنا چاہیے کہ ہمارا سیکورٹی کا نظام کمزور اور غیر مؤثر ہے اور اس میں جس نوعیت کی تنظیم نو کی ضرورت ہے، شائد ہمارے ذمہ دار حلقوں میں اس کا ابھی تک شعور بھی نہیں ہے۔

صدر کی سیکورٹی کی ذمہ داری اور طریق کار: آپ کے علم میں ہے کہ صدر کی حفاظت کی ذمہ داری سول نظام یعنی پولیس اور وزارت داخلہ کی ہے جبکہ چیف آف آرمی سٹاف کے تحفظ کی ذمہ داری فوج کی ہے۔ اور یہ اصول ہے کہ فوج کے جس کمانڈ کے علاقے میں چیف آف سٹاف کبھی جائے گا یا ہو گا، وہاں کی سکیورٹی کے ذمہ دار اس علاقہ کی کمانڈ ہوتی ہے۔ گویا کہ جنرل مشرف کی حفاظت کے لیے دو طریقے ہیں، ایک پولیس کا اور ایک فوج کا۔ کیا وجہ ہے کہ یہ دونوں غیر مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ انٹیلی جنس کسی واقعہ کے بعد واویلا کرنے کا نام نہیں بلکہ اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایسے واقعات کے رونما ہونے سے پہلے ان کی سن گن لی جائے، خدشات کا اندازہ کیا جائے اور اس طرح واقعات کے رونما ہونے سے پہلے ان کا تدارک کیا جا سکے۔ لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ انٹیلی جنس کا نظام روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ مختلف سطحوں پر رابطہ کا نظام مؤثر نہیں ہے بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ یہ نظام بعض اوقات گمراہی اور غلط رہنمائی پر مبنی ہے۔

میں ایک نہیں دنیا کے ۵۰ سے ۶۰ ممالک میں خود گیا ہوں، میں نے وہاں کے حالات کو دیکھا ہے اور میرا عام مشاہدہ ہے کہ دنیا میں سکیورٹی کے لیے کہیں بھی وہ ڈھول ڈھمکا نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں کیا جاتا ہے۔ تین گھنٹے پہلے راستے بند ہوتے ہیں، ہزاروں پولیس والے جنہیں اپنے اپنے علاقے میں عوام کی سیکورٹی اور امن و امان کے لیے ڈیوٹی انجام دینی چاہیے، ان راستوں پر کھڑے ہوئے انتظار کرتے ہیں، اونگھتے ہیں اور ہر ایک کو بتا رہے ہوتے ہیں کہ یہاں کوئی آنے والا ہے۔ میں نے دنیا میں یہ کہیں نہیں دیکھا۔

ٹھیک ہے سیکورٹی کے انتظامات بہت ضروری ہیں لیکن اس کے لیے ہزاروں افراد کو اس طریقے سے ان کے فرائض سے فارغ کر دینا اور پھر بھی نتائج کے اعتبار سے سیکورٹی کا حاصل نہ ہونا، میں نے یہ کہیں نہیں دیکھا۔ جو کچھ ہوا ہے اس کا تقاضا ہے کہ انٹیلی جنس اور جو

نظام ہم نے بنایا ہے اس پر مکمل طور پر نظر ثانی کی جائے۔ حکومت کی طرف سے میرے جن ساتھیوں نے یہ بات کہی ہے کہ انٹیلی جنس کے نظام کا تنقیدی جائزہ لینے، ترمیم کرنے اور تنظیم نو کرنے کی ضرورت ہے، انہوں نے یہ ایک بڑی سچی بات کہی ہے۔ میں اس کی تائید بھی کرتا ہوں اور دعوت دیتا ہوں حکومت اور دوسرے ذمہ داروں کو کہ پورے معاملہ کا تنقیدی جائزہ لیں اور اسے ترجیح دے کر اس معاملے کی فوری فکر کریں۔

دہشت گردی کی جڑ - ناانصافی پر مبنی نظام: دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی اپنی ہر شکل میں، خواہ وہ فرد کی طرف سے ہو، یا کسی گروہ اور خواہ کسی حکومت کی طرف سے ہو، انسانیت کے خلاف ایک ظلم ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کا ہر ممکن طریقے سے تدارک ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اس پر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی اس کا کوئی جواز تلاش کرنا صحیح ہے۔ تاہم میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ معاشرے جن میں انصاف نہ ہو، جن میں آزادی نہ ہو، اور یا جن میں سیاسی عمل کو کام کرنے کا پورا پورا موقع نہ ملے وہاں دہشت گردی جنم لیتی ہے، اور جوں جوں پروان چڑھتی ہے نت نئے نتائج نکال کر دکھاتی ہے۔ ہمیں اس کے اسباب کو سمجھنے کے لیے، ایک واقعہ کو نہیں بحیثیت مجموعی ملک کی تمام صورت حال کو سامنے رکھنا ہو گا۔

میں اس کی بھی تائید کرنا چاہتا ہوں کہ نظام انصاف کے لیے جو تحفظ درکار ہے اور اس کے لیے جو طریقہ رائج ہے اس میں بھی بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اس بات پر ہر ایک کو یقین ہونا چاہیے کہ مظلوم کو جلد انصاف فراہم ہو گا اور جس نے بھی جرم کیا ہے وہ بچ نہیں سکتا۔ یہ سب بے حد ضروری ہیں۔ لیکن ان حوالوں سے ہماری صورت حال بہت خراب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذرا پیچھے جایئے۔ اس سے پہلے ایسے واقعات ہوئے ہیں جنہوں نے آپ کی فوجی لیڈر شپ تک کو ختم کر دیا۔ کیا کوئی انکوائری ہوئی؟ کوئی مجرم پکڑا گیا؟ کسی کو سزا دی گئی؟ آپ کا پہلا وزیر اعظم کس طرح شہید کیا جاتا ہے لیکن کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا کسی کو سزا نہیں دی گئی بلکہ جو پولیس آفیسر اس وقت ڈیوٹی پر تھے وہ ترقی پا کر آئی جی ہی نہیں

بلکہ گورنر تک بن گئے۔ یوں یہ بڑی لمبی تاریخ ہے اور ہمیں ان تمام چیزوں کے حل کے لیے تعصب، سیاسی جانبداری اور جماعتی وابستگی سے بلند ہو کر اس ملک اور ریاست کی خاطر پورے نظام پر غور کرنا ہو گا۔ جب تک آپ یہ کام نہیں کریں گے آپ اس ملک سے دہشت گردی کو دور نہیں کر سکتے ۔ میں ایک جملے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ انصاف دیں گے تو دہشت گردی ختم ہو گی اور اگر انصاف نہیں ہو گا تو ناانصافی اور ظلم ہزار راستوں سے اس ملک کو کمزور اور خدانخواستہ تباہ کرے گا۔ یہی بات مجھے اس طرف لے کر آتی ہے کہ معاملہ دراصل کسی ایک شعبہ کا نہیں بلکہ ملک کے پورے نظام سے متعلق ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

دستور کا تقدس اور اس پر عمل درآمد: میں آج اس فورم پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ایک سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد حکومت اور ایم ایم اے کے درمیان اب جو معاہدہ ہوا ہے وہ کوئی آئیڈیل چیز نہیں ہے اور جب بل آئے گا تو ہم ان شاء اللہ اپنے خیالات کا اس موقع پر کھل کر اظہار کریں گے۔ البتہ میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری اول کوشش یہ تھی، ہے اور رہے گی کہ اس ملک میں نظام درست ہو۔ مذکورہ معاہدہ کے ذریعہ ہم گاڑی کو دوبارہ پٹڑی پر لے کر آئے ہیں، لیکن اس کی رفتار اور اس کی نفاست کی باریکیاں یہ سب انشاء اللہ بعد کی باتیں ہیں۔ لیکن پہلی چیز یہ ہے کہ ہم نظام کی طرف توجہ دیں۔ جب تک نظام درست نہیں ہوتا، یعنی ہر شخص اپنی حدود کا احترام نہیں کرتا اس وقت تک ملک اور معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ جہاں دستور کو توڑنا، دستور سے مذاق کرنا، قانون کو توڑنا وقت کی ریت بن گیا ہو اور جب یہ عمل بار بار ہو رہا ہو تو پھر اس کی قیمت پوری قوم کو ادا کرنا پڑتی ہے۔ ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ٹھیک ہے۔ ماضی میں جو بھی انحرافات ہوئے لیکن اب ان انحرافات کی بھی اصلاح اس طرح ہو کہ جس سے کم از کم ایک دستوری، جمہوری، پالیمانی نظام، پارلیمان کی خود مختاری اور قانون کی حکمرانی بحال ہو جائے۔ اسی لیے ہم نے معاہدے پر مذاکرات کے دوران کسی تاوان یا تلافی پر زور نہیں دیا۔ اس کے بغیر محض اصول کی خاطر اور اس ملک کو جمہوریت کے

راستے پر ڈالنے اور آگے بڑھانے کے لیے اور جس کشمکش میں پارلیمنٹ ایک سال تک مبتلا رہی، اسے باہم معاہدہ کے ذریعہ نکالنے کے لیے کوشش کی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا کرے کہ ہم آخری مرحلے تک اس کو پورا کرلیں۔

لیکن زیر بحث واقعہ کے پس منظر میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک بڑا گہرا تعلق لیگل فریم ورک آرڈر (LFO) کا اور دستور کو توڑنے، قانون کی خلاف ورزی کرنے اور اس قسم کے واقعہ میں ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ جب تک ادارے مستحکم نہیں ہوں گے بات نہیں بنے گی۔ کسی بھی ملک میں استحکام محض فرد کے ذریعے حاصل نہیں ہوتا۔ افراد کی بڑی اہمیت ہے اور قوموں کی زندگی میں اور تاریخ میں افراد کا بڑا کردار رہا ہے لیکن قوموں میں استحکام صرف اداروں کے قیام اور ان کی مضبوطی سے آتا ہے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں حضور پاک ﷺ سے زیادہ اہم فرد اور کون ہو سکتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو مسلمان کس قدر پریشانی میں مبتلا تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسا انسان کہتا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے گا کہ حضرت محمد ﷺ وفات پا گئے ہیں تو وہ اس کا سر قلم کر دیں گے۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ وصال فرما گئے ہیں، انہیں آخر ایک دن اللہ تعالیٰ کے پاس جانا تھا، اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہیں اور جو دعوت، پیغام اور نظام نبی ﷺ نے ہمیں دیا ہے وہ اصل چیز ہے، اس سے ہی استحکام حاصل ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ **علیکم بسنتی وسنت خلفائے راشدین**۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ”میں ہوں گا یا نہیں ہوں گا لیکن میری سنت اور میری سنت پر چلنے والے ادارے اور خلفائے راشدین ہوں گے اور ان کا اتباع تمہارے لیے نجات اور کامیابی کا راستہ ہے“۔ یہ وہ چیز ہے جس سے استحکام حاصل ہو سکتا ہے۔

جناب چیئرمین! ہماری اپنی اس روایت کے ساتھ ساتھ میں آپ کے سامنے مغربی دنیا کی مثال پیش کرتا ہوں۔ فرانس کے وزیر اعظم کلے مین شو (Clemenceau) کو جب

پہلی جنگ میں کامیابی حاصل ہوئی تو اس کے بعد بہت بڑا جشن منعقد ہوا۔ اس موقع پر کسی نے کلے مین شو سے کہا کہ جناب وزیر اعظم آپ فرانس کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ جواباً اس نے مسکرا کر کہا کہ میرے دوست قبرستان ایسے ناگزیر اشخاص سے بھرے پڑے ہیں۔ معلوم ہوا کہ استحکام اداروں سے آتا ہے صرف افراد سے نہیں۔ اسی طرح میں برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل کا واقعہ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ جب دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں چرچل سے کہا گیا کہ تم جنگ میں کامیابی کے لیے اتنے پر اعتماد کیسے ہو، شہر کے شہر تباہ ہو رہے ہیں، گولے برس رہے ہیں حتٰی کہ پارلیمنٹ پر بمباری ہوئی ہے، پھر تمہارے اعتماد کی بنیاد کیا ہے؟ اس نے جواب میں بہت قیمتی بات کہی کہ جس وقت تک اس ملک میں عدالتیں انصاف دے رہی ہیں ہمیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

اداروں کو مضبوط کیجیے: جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ استحکام افراد سے نہیں، اداروں سے حاصل ہوتا ہے۔ آیئے! اداروں کو بنانے کی فکر کریں، قانون کا احترام کریں، ہر سطح پر کریں۔ اگر اوپر والے اعلیٰ طبقات اور ذمہ دار افراد قانون کو توڑیں گے تو نیچے والے بھی توڑیں گے اور اگر اوپر والے قانون کا احترام کریں گے تو سب قانون کا احترام کریں گے۔ یہ راستہ ہے اس ملک میں استحکام کو لانے، معاشرے سے تشدد اور لاقانونیت دور کرنے کا۔ ہم سب کو مل کر اس کے لیے کوشش کرنا ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک اچھی ابتداء کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کامیاب ہو، اس میں اپوزیشن اور حکومت دونوں کو سمجھداری، رواداری اور اصول پرستی سے کام لینا ہوگا۔ حق پر قائم رہنا، انتہاپسندی نہیں ہے، پسپائی کے معنی لچک نہیں ہے، اصول پر استحکام ہونا چاہیے لیکن اصول کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی، تدبیر منزل اور جو اصل حقائق ہیں ان کو سامنے رکھ کر راستہ نکالنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ چیز کہ جس پر اتفاق ہو اسے ہم سب مل کر پورا کریں اور جہاں اختلاف ہو، وہاں اختلاف کا ہم احترام کریں۔ ذاتی بنیادوں پر ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور گرانے کی کوشش نہ ہو۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے ہم اس ملک میں بگاڑ کو اصلاح کی طرف لے جاسکیں

گے۔ جس امتحان میں آج پاکستان، بلکہ میں کہوں گا امت مسلمہ مبتلا ہے اس سے نکلنے کا یہی راستہ ہے۔

جناب والا! ان الفاظ کے ساتھ میں ایک بار پھر اس واقعہ کی مذمت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ پاکستان کو دہشت گردی کے ہر فتنے سے محفوظ رکھے۔ اس بات کی بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کی قیادت کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ ان واقعات کو محض سرسری طور پر نظر انداز نہ کر دے بلکہ جس قسم کی اصلاح کی ضرورت ہے اس کی فکر کرے۔ اصل ضرورت نظام کی اصلاح کی ہے، ہمیں ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں قانون اور دستور کی پابندی کی جائے اور جس میں ملک کی سیاسی فضاء افہام و تفہیم اور مل جل کر معاملات کو طے کرنے کی طرف لے جانے کی ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں حق اور انصاف کا بول بالا کسی بھی دیگر چیز سے زیادہ اہم ہو۔ اگر حق اور انصاف کو نظر انداز کیا گیا تو پھر کبھی خیر رونما نہیں ہو گا لیکن اگر ہم نے حق اور انصاف کا دامن تھاما تو ان شاء اللہ تمام مشکلات کے باوجود اور دشمنوں کی ہر کوشش اور سازش کے باوجود، ہمارے قدم آگے بڑھیں گے۔

(۲۶ دسمبر ۲۰۰۳ء)

لال مسجد پر یورش اور جامعہ حفصہ کا بحران

جناب چیئرمین! اس سیشن میں، میں آپ کا، اور قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کا بے حد ممنون ہوں کہ لال مسجد کے اس اہم مسئلہ پر پہلا پوائنٹ آف آرڈر اٹھانے کا موقع مجھے دیا گیا ہے۔ یہ ہولناک واقعہ، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سینیٹ کے اجلاسوں کے درمیان رونما ہوا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ پر فوجی یورش ہماری تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب ہے۔ یہ مسئلہ نہ اب ایک جامعہ کا مسئلہ ہے اور نہ دو افراد کا، بلکہ اس کی حیثیت ایک بین الاقوامی مسئلہ کی ہوگئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک نظریاتی مسئلہ ہے جو براہ راست اس ملک کے نظریاتی اور سیاسی مستقبل سے جڑا ہوا ہے۔

اس پہلو سے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑا اہم ہے کہ یہ ایوان کھل کر اس کے سارے پہلوؤں پر بحث کرے۔ جو بنیادی سوال اب پوری قوم کے اور ساتھ ہی دنیا بھر کے سامنے ہیں ان کا تمام پہلوؤں سے سامنا کیا جائے اور جو افراد بھی جس حد تک ذمہ دار ہیں ان کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ یہ محض تاریخ کا کوئی بھلا دینے والا واقعہ نہیں ہے بلکہ ایسا واقعہ ہے جو ہماری تاریخ کے رخ کو بدل دے گا۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت پر اس بات کو منظور کیا ہے کہ جتنی بھی تحریک التواء اور توجہ دلاؤ نوٹسز اس سلسلے میں مختلف ارکان نے جمع کیے ہیں ان کو جمع کر کے اس مسئلے پر مفصل بحث کی جائے لیکن میں ضروری سمجھتا تھا کہ سب سے پہلے ریکارڈ پر لاؤں کہ ہماری نگاہ میں یہ محض ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ آج ہماری خود مختاری اور ہماری شناخت دونوں کے اعتبار سے یہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ (۱۰ اگست ۲۰۰۷ء)

امن وامان کی عمومی صورت حال: جناب چیئرمین! میں بہت ہی دکھی اور زخمی دل کے ساتھ یہ گزارشات آپ کی خدمت میں اور آپ کے توسط سے اس ملک کے حکمرانوں اور خصوصیت سے پارلیمنٹ کے سرکاری بنچوں سے تعلق رکھنے والے ارکان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بلاشبہ میری معروضات کا مرکزی حوالہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا خونی سانحہ ہے، لیکن جناب والا! یہ بات امن و امان کی عمومی کیفیت کے پس منظر میں پیش کی جارہی ہے۔ اس لیے آپ کے سامنے صرف اتنا رکھوں گا کہ ملک میں بدامنی، جان و مال کا عدم تحفظ، عزت کا عدم تحفظ، چوری، ڈاکہ، اغواء، ہر قسم کے جرائم کی جو کیفیت آج پیدا ہو چکی ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی۔

کل کے اخبارات میں صرف لاہور کے بارے میں جو رپورٹ سرکاری طور پر شائع ہوئی۔ اس کے مطابق وہاں ہر قسم کے جرائم کا اضافہ ہوا ہے۔ انسانی زندگی ہو یا مال واسباب اور جائیداد، کوئی چیز بھی محفوظ نہیں ہے۔ صوبائی دارالحکومت ہونے کے باوجود اس شہر میں صرف سات مہینے میں جرائم میں ۱۲۵ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ جناب والا! یہ اس زمانے میں ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اچھی حکمرانی ہے اور گورنمنٹ کی رٹ سب سے مقدس اور اہم چیز ہے لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ وہ رٹ عملاً کہیں نظر نہیں آتی۔ جو مجبور اور کمزور ہو یا جو اپنا دفاع نہ کر سکے، ان پر تو یہ خوب شیر ہیں، لاٹھیاں اور گولیاں برساتے ہیں، لیکن جو اصل مجرم ہیں، وہ نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ ان کو اور بھی تحفظ دیا جارہا ہے۔ اور یہ صرف لاہور میں نہیں، ملک کے ہر گوشے میں کم و بیش یہی صورتحال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں حکومت کی غفلت اور بے حسی، برداشت کی تمام حدود کو پار کر گئی ہے۔

پاکستانی تاریخ کا تاریک ترین سانحہ

جناب والا! جہاں تک جامعہ حفصہ کا مسئلہ ہے میں بڑے ادب سے یہ عرض کروں گا کہ میں نے برطانوی دور کا آخری زمانہ بھی دیکھا ہے، جو مظالم برطانوی فوجوں اور ان کی

موجودگی میں ہندوؤں نے اور سکھوں نے کیے، وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس کے علاوہ بھی پاکستان کے ان ساٹھ سالوں میں بہ چشم سر بہت کچھ دیکھا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ دس اور گیارہ جولائی کو اسلام آباد میں جس کربلا صغریٰ کو قائم کیا گیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ جس بے دردی کے ساتھ قوت کا ننگا استعمال کیا گیا، معصوم انسانوں کا خون بہایا گیا اور جو چیز ہمارے لیے سب سے زیادہ مقدس تھی یعنی اللہ کی کتاب، مسجد، مدرسہ، عورت، ماں، بیٹی کا تقدس، ان سب کو جس طرح آپریشن میں پامال کیا گیا، اس کی کوئی بھی توجیہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

جناب والا! بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ کرنے والے جنرل ڈائیر اور اس کے فوجی نہ تھے جنہوں نے ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں ہندوستانیوں کا خون بہایا تھا، نہ ہی یہ رنجیت سنگھ کے وہ سپاہی تھے جو کہ جوتیاں پہن کر بادشاہی مسجد میں داخل ہوئے تھے اور اس وقت مسلمان خون کے آنسو روئے تھے۔ بدقسمتی سے یہ ہمارے اپنے تھے، وہ جن کا نعرہ ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جن سے اس ملک کے افراد کی جان، مال اور عصمت کی حفاظت مقصود ہے۔ وہ جو تے پہن کر مسجد میں داخل ہوئے اور جب اس بے ادبی کے بارے میں استفسار کیا گیا تو سرکاری ترجمان بی بی سی پر دھڑلے سے کہتا ہے کہ جس وقت آپریشن ہو رہا تھا تو لال مسجد، مسجد نہیں رہی تھی۔ جناب والا! جو ملبہ وہاں سے ملا ہے اس میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کو شہید کیا گیا ہے، خون کے لوتھڑے ہیں، اس میں معصوم بچیوں کے خون زدہ لباس ہیں۔

جناب والا! یہ وہ سانحہ ہے جسے میں پاکستان کی تاریخ کا تاریک ترین سانحہ قرار دیتا ہوں۔ اس کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں کیا جانا چاہیے تھا، یہ محض ایک مسجد، ایک مدرسہ یا دو افراد کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بڑا بنیادی اور اصولی مسئلہ ہے، اس کی بناء پر ہماری قوم، ہماری عزت اور درحقیقت پوری امت متاثر ہوئی ہے۔ اس بنا پر جناب والا! میں نہایت ہی مختصر لیکن ٹھوس دلائل کے ساتھ کچھ واقعات آپ کے اور اس

ایوان کے سامنے رکھ رہا ہوں اور سرکاری پارٹی کے ارکان سے بھی درد دل کے ساتھ استدعا کرتا ہوں کہ اسے جماعتی بنیاد پر نہ لیں۔ یہ ایک قومی سانحہ اور قومی حادثہ ہے اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم دنیا کے سامنے پاکستان اور اسلام کی کیا تصویر پیش کر رہے ہیں۔

میرے بھائی مشاہد حسین صاحب نے اپنی رپورٹ میں بڑا صحیح کہا کہ ہماری خارجہ امور کی کمیٹی نے متفقہ طور پر امریکہ کی اس پالیسی کی مذمت کی ہے کہ وہ سیاسی مسائل کو قوت سے حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ جو بات آپ بش کی پالیسی کے بارے میں کہہ رہے ہیں، آپ کی اپنی پالیسی بھی اس سے کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ کل کابل جرگے میں بڑے فاخرانہ انداز میں کہا گیا ہے کہ دشمن سے مذاکرات کرو۔ ضرور کرنا چاہیے۔ کہا گیا ہے کہ قوت کا بے محابہ استعمال مسائل کا حل نہیں ہے، وہ مسائل کو بگاڑتا ہے۔ بالکل صحیح کہا، لیکن آپ خود کیا کر رہے ہیں؟ مذاکرات جو مسائل کا حل ہیں، آپ کی جانب سے انہیں سبوتاژ کیا جاتا ہے، اور اس کے لیے معصوموں کا خون بہایا جاتا ہے۔

پالیسیوں پر نظر ثانی کی ضرورت

جناب والا! ہمیں اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنے اور اس پر قومی اتفاق رائے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ مذہبی انتہا پسندی غلط ہے، لیکن بالکل اسی طرح یہ نام نہاد لبرل انتہا پرستی بھی غلط ہے۔ سیاسی مسائل، سیاسی طریقے سے حل ہوتے ہیں۔ ذہنوں کی تبدیلی، افہام و تفہیم کے ذریعے معاملات کو حل کرنا اور اس میں جتنا وقت بھی لگے، اس کی گنجائش پیدا کرنا ہی مہذب معاشرے کا طریقہ ہے، قوت کا استعمال اس کا کبھی بھی حل نہیں ہے۔ اس ضمن میں جناب والا! بنیادی طور پر میں پانچ باتیں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔

الزامات کی نوعیت اور ان کی حقیقت: پہلی بات یہ ہے کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے بارے میں جو کچھ جولائی ۲۰۰۷ء میں کیا گیا وہ غیر ضروری اور غیر منصفانہ تھا جس میں

ہر اصول، قانون، ضابطے اور روایت کو توڑا گیا۔ مجھے اس اصول پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ قانون سب کے لیے ہے اور کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے۔ اس معاملے میں لال مسجد کی انتظامیہ اور جامعہ حفصہ کے طلبا سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، اور جو بچکانہ حرکتیں انہوں نے کی ہیں، نہ کوئی اس کو نظر انداز کر رہا ہے اور نہ کبھی کیا جانا چاہیے۔ یہ باتیں ہم آج نہیں کہہ رہے، جس وقت یہ واقعات ہوئے، ہم نے اس وقت بھی اس پر گفتگو کی تھی، اپنے افسوس کا اظہار کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ایک اچھے مقصد کے لیے آپ غلط طریقہ استعمال کر رہے ہیں، جو اسلام اور قانون دونوں کے خلاف ہے، ہم آج بھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن آج ہم یہ بات بھی زور دے کر کہنا چاہتے ہیں کہ غلطی اور سزا، جرم اور تعزیر دونوں کی ایک نسبت ہوتی ہے۔ اگر قانون نافذ کرنے والے غلطی اور جرم کی مناسب اور متناسب سے زیادہ سزا دیتے ہیں تو وہ خود ایک بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

زمین پر قبضہ اور تجاوزات کا مسئلہ: جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جو الزامات جامعہ حفصہ کے طلبا اور اس کے اساتذہ پر لگائے جا رہے ہیں، ان میں سب سے پہلی بات تجاوزات سے متعلق ہے کہ اس جامعہ نے تجاوزات کیں اور سرکاری زمین پر قبضہ کر کے اپنی عمارات کو بڑھالیا۔ چنانچہ یہ غیر قانونی تھی۔ میں یہ اصولی بات کہنا چاہتا ہوں کہ مسجد ہو یا مدرسہ، اس کی زمین جائز طریقے سے حاصل کرنی چاہیے، یہی ہماری روایت ہے اور یہی شرعی احکام ہیں۔ اس معاملے میں اگر کسی سے غلطی ہوئی ہے تو اس کی گرفت بھی ہونی چاہیے اور اصلاح بھی ہونی چاہیے۔ قانون کے اندر دونوں راستے موجود ہیں، تجاوزات کو قانون کے مطابق، قانون کے ذریعے اور عدالتی عمل کے ذریعے ختم کرنا اور اگر ممکن ہو تو پھر اس زمین کے بارے میں کوئی تصفیہ کر کے اسے فروخت کر دینا۔ خاص طور پر سرکاری زمینوں کے بارے میں ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ اگر کوئی مفید ادارہ کسی سرکاری زمین پر بنایا گیا ہے اور وہ اس کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہے تو یہ کیا جاتا ہے، یہ معروف چیز ہے۔

جناب والا! میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ لال مسجد ۱۹۶۶ء میں قائم ہوئی، جبکہ جامعہ

۱۹۹۲ء میں قائم ہوئی ہے۔ یوں یہ مسجد اور جامعہ دہائیوں سے موجود ہیں۔ مسجد کے بارے میں کوئی تنازعہ نہیں ہے کیونکہ اس کی زمین اوقاف کے تحت ہے اور قانونی ہے۔ جامعہ حفصہ کے بارے میں یہ بات صحیح ہے کہ جتنا پلاٹ اس کو الاٹ کیا گیا تھا، اس کو اس سے کہیں زیادہ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تعمیر رات کو تاریکی میں تو نہیں کی گئی، کھلے بندوں ہوئی، ایک دن میں تو تعمیر نہیں ہو گئی، یہ جنوں نے تو تعمیر نہیں کر دی، اس میں کئی سال لگے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تعمیر کے دوران ذمہ دار ادارے اور اہلکار کہاں سوئے رہے؟ جنوری ۲۰۰۷ء میں ۷ ۲ سال کے بعد یہ احساس کیوں ہوا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ یہ طوفان کیسے آ گیا؟ دوسری جانب اس دوران ان مسجدوں کے بارے میں جو تقسیم سے پہلے سے موجود ہیں، انہیں بھی شہید کیا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد معافی مانگی گئی اور وزیر مذہبی امور اور سیکرٹری نے وعدہ کیا کہ ہم ان مساجد کو دوبارہ بنائیں گے۔ لیکن کیا ہوا؟ کسی وعدہ پر عمل نہیں ہوا؟ آخر یہ کیا وجہ ہے کہ جنوری سے جولائی ۲۰۰۷ کے دوران میں یہ ایک ہوّا اٹھایا گیا، بین الاقوامی پروپیگنڈا بھی ہوا، ملک میں طرح طرح کی باتیں کی گئی ہیں اور اس کے بعد یہ خونی ڈرامہ رچایا گیا ہے۔

کیا تجاوزات کی یہ واحد مثال تھی؟ جناب والا! میں آپ سے یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ بلاشبہ تجاوزات غلط ہیں لیکن کیا یہ صرف جامعہ حفصہ کے لیے ہیں۔ اسلام آباد میں کون سی کوٹھی ہے جس میں تجاوز نہیں کیا گیا؟ جناب والا! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ لاہور کے بارے میں قبضہ گروپ کی سرکاری رپورٹ آئی ہے جس میں کہا گیا ہے:

> اس قبضہ گروپ نے آثار قدیمہ کو بھی نہیں بخشا اور صرف لاہور میں مختلف قسم کی ۲۲۳۰ تجاوزات ۱۲۵ تاریخی عمارات اور یادگاروں کی شکل بگڑ گئی ہے۔

یہ صرف ایک معاملہ ہے ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، کون سی جگہ ہے جہاں زمینوں پر قبضہ خود فوج اور اس کے وابستگان نے نہیں کیا ہے۔ میں سینیٹ کی انسانی حقوق کمیٹی کا رکن ہوں، ایس ایم ظفر صاحب یہاں موجود ہیں، ہمارے سامنے اوکاڑہ کے فارم کا کیس آیا اور ہم نے ریسکیو ٹیمیں بھیجیں، وہاں تمام زمینوں پر قبضہ ہے۔ اسلام آباد

دارالحکومت ہے، یہاں پولیس کس طرح زمینوں پر قبضہ کر رہی ہے اس کی بھی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ پولیس اسٹیشن ایک سرکاری ادارہ ہے لیکن اس کی عمارت پھر بھی ایک پرائیویٹ حیثیت رکھتی ہے۔ میں یہ ڈیلی ٹائمز کی ۱۱ اگست ۲۰۰۷ء کی رپورٹ سنا رہا ہوں جناب والا! اس کو سنیں اور غور سے سنیں، کہا جاتا ہے کہ:

> کیپٹل پولیس نے بیرکوں اور پولیس تھانوں کی غیر قانونی تعمیر کے لیے زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ دیہی سب ڈویژنل پولیس آفیسرز کے دفاتر اسلام آباد ہائی وے سے متصل گرین بیلٹ میں تعمیر کیے گئے ہیں جو کہ غیر قانونی ہے۔ سی ڈی اے کی اجازت کے بغیر گرین ایریا میں پانچ بیرکیں تعمیر کی گئی ہیں جس سے شہر کی خوبصورتی بھی متاثر ہوئی ہے۔ ان بیرکوں میں پانچ سو پولیس اہلکار رہائش پذیر ہیں۔

یہ تین کالم کی رپورٹ ہے جس میں ایک نہیں بیسیوں جگہوں کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے۔ یہ زمینوں پر قبضے کی پوزیشن ہے۔ جناب والا! میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کراچی، جہاں یہ قانون موجود ہے کہ کس علاقے میں کتنی اونچائی کی بلڈنگ بن سکتی ہے اور جہاں قانون واضح کر دیا گیا ہے کہ قائداعظم کے مزار کے ارد گرد ایک خاص علاقے کے اندر کتنی اونچائی کی بلڈنگ بن سکتی ہے وہاں متعدد عمارات تعمیر ہوئی ہیں جو اس حد سے زیادہ بلند ہیں۔ کیا یہ زمین پر قبضہ نہیں ہے؟ کیا یہ قانون کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

ابھی اسی ہفتے کاؤس جی نے ڈان میں مضامین کی جو سیریز لکھی ہے اس میں ایک عجیب و غریب مثال انہوں نے دی ہے۔ آئی آئی چندریگر روڈ کے اوپر ہزاروں مربع میٹر کے پلاٹ ہیں جسے سندھ کی حکومت نے متعین کاموں کے لیے ریلوے کو دیا تھا۔ اس جگہ کو ان کاموں سے علیحدہ کر کے ایک نیم فوجی ادارے کے تعاون سے ۴۲ منزلہ عمارتیں بنائی جا رہی ہیں۔ ان تعمیرات پر بلڈنگ اتھارٹی کے علاوہ ایک خصوصی کمیٹی اور ایک وزیر اعلیٰ کی کمیٹی، تینوں نے اعتراض کیا کہ یہ غلط اور غیر قانونی ہے یہ نہیں ہونا چاہیے لیکن کور کمانڈر کے حکم

پر، چیف منسٹر نے رعایت دی، اس سلسلہ میں کور کمانڈر کا خط بھی موجود ہے۔ کیا یہ زمینوں پر قبضہ نہیں ہے؟ جناب والا! میں آپ کو کتنی مثالیں دوں؟ حقیقت یہ ہے کہ پورے ملک میں یہ ہو رہا ہے۔ تو کیا صرف جامعہ حفصہ کے دو سو گز ایسے تھے کہ جس کے لیے آپ خون کی ندیاں بہائیں اور کربلا کا سماں پیدا کریں؟

لوگوں کے اغواء کا الزام: جناب والا! یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے لوگوں کو اغواء کیا، انہوں نے وڈیو شاپس کی کیسٹیں جلائیں، مساج پارلر سے لوگوں کو لا کر ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ بلاشبہ انہوں نے یہ سب کچھ کر کے اچھا نہیں کیا۔ یہ سارے کام غلط تھے، انہیں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جن معاملات میں ملکی قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہو حکومت کی ذمہ داری کیا تھی؟ شراب، بدکاری کے اڈے، فحش فلمیں یہ کون سے قانون میں جائز ہیں؟ آپ کا قانون ان کو منع کرتا ہے لیکن آپ اس قانون کو نافذ نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری جانب کیا اس ملک میں اغوا، جبری گمشدگی، گھروں پر حملے، زیر حراست اموات نہیں ہو رہی ہیں؟ اغواء برائے تاوان ایک بڑی انڈسٹری بن چکی ہے جس میں بڑے بڑے لوگ ملوث ہیں، جو جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ، ٹیلیفون، وائرلیس، کمپیوٹر کے ذریعے سے اس کام کو کر رہے ہیں۔ سب کو پتا ہے کہ اس میں کون کون ملوث ہیں۔ پولیس سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے افسران، بڑے بڑے زمیندار، جاگیر دار، سرمایہ دار اور وڈیرے ان کاموں میں ملوث ہیں۔ بلاشبہ ان لوگوں نے غلط کام کیا لیکن کیا ان میں سے کسی پر ہاتھ ڈالا گیا۔ درحقیقت جامعہ حفصہ کی طالبات نے اگر کسی کو پکڑا بھی تھا تو ان لوگوں کی کسی ذلت کے بجائے ان سے اعزاز و اکرام کے ساتھ معاملہ کیا۔ اس کے بعد خاموشی سے ان کو چھوڑ دیا۔ لیکن آپ اس کے بدلے میں کیا کرتے ہیں؟ آپ دھجیاں اڑا دیتے ہیں، آپ عورتوں اور بچوں کو، طالب علموں اور اساتذہ کو، قرآن کو اور اسلامی کتابوں کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ کیا تناسب ہے جرم اور اس کی سزا کے درمیان؟ جناب والا! حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی ایک جواز بھی نہیں دیا جا سکتا جس کی بنیاد پر آپ کے اس بدترین نوعیت کے ایکشن کی گنجائش نکل سکے۔

جامعہ حفصہ میں کیا ہوتا تھا؟ جناب والا! میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اقدامات بلاجواز اور غیر منصفانہ ہیں۔ یہاں مجھے آپ اجازت دیں کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ تحقیق میں مصروف محترمہ ڈاکٹر مسعودہ بانو کی تحریر میں دیا گیا تجزیہ آپ کے سامنے پیش کروں۔ محترمہ بانو اعلیٰ درجہ کی ایک محقق ہیں جن کے مضامین بین الاقوامی جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ پانچ اور دس مئی کے آپریشن سے پہلے ان کے مضمون "The Puzzle of Jamia Hafsa" سے لی گئی تفصیل کے تناظر میں دیکھیے کہ اس پورے معاملہ میں کس طرح کا مبالغہ اور غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے سلسلے میں بہت سی چیزیں غیر معمولی ہیں جن میں ان کے منتظمین کی غلطیاں بھی شامل ہیں۔ لیکن اس واقعہ کو ملک کے میڈیا اور لبرل عناصر نے اور پھر پوری دنیا نے ایک ہوّا اور ایک آسیب اور آزار بنا کر پیش کیا جس سے پاکستان کا تاثر اور تصور متاثر ہوا؟ لیکن آپ یہ دیکھیے کہ ڈاکٹر مسعودہ جو ان دینی مدارس کے اوپر آکسفورڈ میں ریسرچ کر رہی ہیں، انہوں نے کیا نتائج اخذ کیے ہیں۔ ڈاکٹر بانو نے ۷۰ پاکستانی مدارس کا مطالعہ کر کے رپورٹ تیار کی ہے۔ اس دوران وہ جامعہ حفصہ بھی گئیں اور وہاں کے اساتذہ اور طالبات سے بھی انٹرویوز کیے ہیں، اس حوالہ سے اپنی رپورٹ میں وہ کہتی ہیں:

> تاہم اسی لبرل حلقے سے تعلق رکھنے اور جامعہ حفصہ کے متعدد دوروں، عبدالرشید غازی سے ملاقاتوں اور انٹرویوز کے باوجود میرا ذاتی تجربہ اس خوفناک شبیہ کو قبول نہیں کرتا جس کا تذکرہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی آراء اور ردعمل کو دیکھ کر میں حیرت زدہ ہوں کہ مدرسہ کے اندر مجھے یہ جگہ کسی بھی گرلز ہاسٹل کی طرح لگتی ہے۔ لڑکیوں کے پاس بلاشبہ اسلام کی خالص اور سخت توضیحات ہیں لیکن وہ سوچ سمجھ کر بات کرتی ہیں۔ اپنی گفتگو میں وہ قبائلی علاقوں میں حکومت کے غیر قانونی آپریشنز، لاپتہ افراد کا مسئلہ، ذرائع ابلاغ کی لامحدود آزادی اور ریاستی نظام کی ناکامی، جہاں کسی بھی سرکاری محکمہ سے بغیر جان پہچان اور تعلق داری کے کوئی

کام نہیں ہوتا، کو اپنے رد عمل کا جواز قرار دیتی ہیں۔ اپنے دوپٹوں میں ملبوس بچیاں آپ کے ساتھ ہنستی بولتی ہیں، گپ شپ کرتی ہیں اور قدامت پسند ذہن رکھنے والی ایک کالج کی کسی بھی عام لڑکی کی طرح ہیں۔

آگے چل کر وہ کہتی ہیں:

جب کوئی عبدالرشید غازی سے ملتا ہے تو وہ یقیناً نفرت اگلنے والے انتہاپسند نہیں ہیں۔ یہاں آس پاس کئی قدامت پسند علماء موجود ہیں۔ عبدالرشید غازی سے آپ باآسانی مل سکتے ہیں۔ وہ آپ کو وقت دیں گے، وہ جدید دنیا کی حقیقتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

جناب والا! آپ کے علم میں ہے عبدالرشید غازی کو بھی دراصل مدرسے کا طالب علم کہا جارہا ہے حالانکہ وہ قائداعظم یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ تھے۔ آپ کی منطق کو تسلیم کیا جائے تو اگر دینی مدارس آپ کے الفاظ میں دہشت گرد پیدا کررہے ہیں تو آخر یونیورسٹیز بھی تو اس طرح کے دہشت گرد پیدا کررہی ہیں۔ آگے چل کر مسعودہ بانو کہتی ہیں:

"ٹھیک ہے، مدرسے میں مسلح چوکیدار ہے لیکن ایک ملک جہاں علماء کرام کو گولی مار دینا ایک معمول ہو، میں حیران ہوں کہ انہوں نے ایک اہم ٹارگٹ ہونے کے باوجود مزید سیکورٹی کا اہتمام کیوں نہ کیا؟"

پھر وہ کہتی ہیں:

"پہلی بات یہ ہے کہ اگر حقیقت میں یہ ایک ایجنسی کا طے شدہ آپریشن ہے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ انتہاپسندی کا منظرنامہ پیش کرنے کے لیے کچھ لوگوں سے کہیں گی کہ وہ انتہائی شدت پسندانہ پوزیشن اختیار کریں۔

دوسرا، اگر یہ ایجنسی کا طے شدہ آپریشن نہیں ہے جیسا کہ مدرسہ والوں کے ساتھ میری بات چیت سے لگتا ہے، اس کے مقابلہ میں کہ وہ حکومت پر قبضہ کرکے

شریعت نافذ کر سکتے ہیں...

جب میں پورے ملک میں ۷۰ مدارس کا دورہ کر کے اور ملاقاتیں کر کے آئی ہوں اور جامعہ حفصہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام مدارس میں حکومت کی امریکی تابعداری کی پالیسیوں، قبائلی علاقوں میں حملوں، لاپتہ افراد کا مسئلہ، اسلام اور مدارس کے خلاف کارروائی کر کے انہیں دیوار سے لگانا اور ذرائع ابلاغ کے لیے بے محابا آزادروی کو پھیلانا ان کی تشویش کا سبب ہے جبکہ یہ ملک اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا"۔

آگے چل کر یہ اشارہ کر کے کہ تمام لوگ کہہ رہے ہیں کہ ان کے خلاف ایکشن لیں، مصنفہ اسے غیر حقیقت پسندانہ سوچ قرار دیتی ہیں اور لکھتی ہیں:

"قدامت پسندانہ اقدار کو پسند کرنے والے آپ کے معاشرہ کا حصہ ہیں۔ اسلام کے اس جنگجویانہ اظہار کو روکنے کا واحد راستہ ایک ہی ہے کہ حکومت دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کی پالیسیوں پر اندھادھند عمل پیرا ہونے کی پالیسی سے رک جائے کیونکہ اس کے سبب علماء کو اپنے پیروکاروں کی بڑی تعداد کو متحرک کرنے کا موقع مل رہا ہے"۔

گفت وشنید کو کامیاب کیوں نہ ہونے دیا گیا: جناب والا! یہ وہ منظر نامہ ہے جس میں، میں یہ بات کہتا ہوں کہ اس آپریشن کا قطعاً کوئی جواز نہیں تھا۔ گفت وشنید کا پورا پورا امکان موجود تھا اور بات چیت ہو بھی رہی تھی۔ ماضی میں ہوئی تھی اور پھر آخری وقت میں تو معاملہ بالکل طے ہونے کے قریب تھا۔ میں اس وقت انگلستان میں تھا، ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ہر لمحہ خبر آرہی تھی کہ معاملات طے ہو گئے ہیں، بس اب صورت حال بہتر ہونے والی ہے۔ دستخط ہونے والے ہیں۔ پھر یہ کیا ہوا کہ اچانک ہی تمام کوششوں کے اوپر پانی ڈال کر آپریشن کر دیا گیا۔

جناب والا! میری نگاہ میں آج ملک کے دینی حلقوں میں سب سے زیادہ محترم، علمی

اعتبار سے بھی، اور پھر تقویٰ کے اعتبار سے بھی، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ہیں، ان کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں ہے۔ آپ کو علم ہے وہ خود اسلام آباد تشریف لائے اور انہوں نے اس پورے معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں جو بیان انہوں نے دیا ہے اس میں تمام تفصیلات دے کر بتایا گیا ہے کہ کس طرح معاہدہ تیار تھا اور وہ نہیں ہونے دیا گیا۔ میں ان کا صرف ایک جملہ آپ کو سنانا چاہتا ہوں جو ان کی معلومات اور تجزیہ کا خلاصہ ہے کہ ''مجھ سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپ اس خون ریزی کی ذمہ داری کس پر ڈالتے ہیں، تو میں نے کہا'' ایوان صدر پر'' حقیقت یہی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اقدامات کی آئینی اور قانونی حیثیت: جناب والا! میں اب اگلے نکتے کی طرف آنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ یہ کارروائی غیر آئینی، غیر قانونی اور بلاجواز ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں یہ بات عرض کروں کہ پچھلے چھ سال سے پوری دنیا کو دہشت زدہ کیا گیا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ کے نام پر جو کچھ کیا جارہا ہے یہ امریکہ کی عالمی بالادستی کے قیام کی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔ میں اس بحث میں نہیں جاتا کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا، جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے جناب والا! کہ جنگ کا لفظ اس دہشت گردی کے خلاف استعمال کرنا ہر طرح سے غلط ہے۔ قانونی اعتبار سے لیں یا فلسفے اور سیاست کے اعتبار سے اور یا بین الاقوامی قانون کے اعتبار سے، جس چیز کو دہشت گردی کہا جارہا ہے یہ غیر متعین ہے۔ یعنی یہ واضح نہیں ہے کہ کیا دہشت گردی ہے اور کیا دہشت گردی نہیں ہے اور اس غیر واضح تصور کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع کر دی گئی۔ فرض کیجیے میں اسے مان لیتا ہوں کہ لڑنے والا ایک دہشت گرد ہے۔ اس ایوان میں قانون کے بہت سے ماہرین موجود ہیں اگر وہ ایمانداری کے ساتھ اس معاملے کا تجزیہ کریں تو وہ میری بات کی تائید کریں گے کہ بین الاقوامی قانون ہو یا ملکی فوجی اور سول قانون کسی بھی قانون کے تحت، اس دہشت گرد کو لڑاکا اور آرمی کے مساوی نہیں مانا جاتا۔ وہ ایک مجرم ہے لیکن قانون کے اندر مجرم اور لڑاکا دو مختلف قسمیں ہیں۔

جناب والا! میں آپ کی توجہ انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون میں شائع ہونے والے سلسلہ مضامین کی جانب دلانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ کے ایک مضمون کے لکھنے والوں میں جو ابھی ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء کو شائع ہوا ہے نیٹو کے سپریم کمانڈر ویزلے کے کلارک (Wesley K. Clark) جو کیلے فورنیا یونیورسٹی لاس اینجلز کے بین الاقوامی تعلقات کے برکلے سنٹر کے فیلو بھی شامل ہیں، دوسرے کال راستیالا (Kal Raustiala) جو قانون کے پروفیسر اور برکلے سینٹر کے ڈائریکٹر ہیں۔

یہ بڑا اہم مضمون ہے اور اس کے اندر یہی بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں۔ اب تک اس کے اوپر پردہ ڈالا گیا تھا لیکن ۲۰۰۴ء میں جب امریکی سپریم کورٹ نے ایک قطری باشندے (علی صالح کاہلا المری) کے بارے میں، جس پر القاعدہ سے رابطے کا شبہ تھا، اور اس بنا پر اس کو دہشت گرد کہا گیا تھا، فیصلہ دیا تو یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ فیصلہ میں کہا گیا ہے کہ اس کو دہشت گرد یا جنگجو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جرم کا زیادہ سے زیادہ شبہ ہے اور یوں یہ معاملہ کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ اس مضمون میں سے جناب والا! میں آپ کو چند جملے سناؤں گا۔ آغاز اس جملے سے ہوتا ہے کہ:

> سپاہی اور شہری کے درمیان خط فاصل ایک طویل عرصہ سے جنگ کے قوانین کا مرکزی موضوع ہے۔ دہشت گردوں سے جنگجوؤں جیسا سلوک کرنا ایک غلطی ہے میں دہراتا ہوں کہ دہشت گردوں سے جنگجوؤں جیسا سلوک کرنا ایک غلطی ہے۔

دہشت گرد تھے یا نہیں تھے، یہ الگ مسئلہ ہے۔ انہوں نے کوئی دہشت گردی کی کارروائی کی ہے یا نہیں کی یہ بھی الگ مسئلہ ہے۔ اس کے بارے میں قانون یہ کہتا ہے کہ دہشت گرد اور جنگجو یکساں نہیں۔ مزید سنیے! ان کا ارشاد ہے:

> دہشت گردوں پر جنگجوؤں کا لیبل لگانا تضاد کا باعث بنتا ہے۔ دوران جنگ شہریوں کو جان بوجھ کر قتل کرنے کی اجازت کبھی نہیں رہی جبکہ فوجی تنصیبات اور اثاثوں

کو نشانہ بنانا قانونی ہے۔

یہ ذرا غور کیجیے کیا جملہ کہا جارہا ہے یہ امریکہ کے دو چوٹی کے پروفیسر ہیں ایک نیٹو کا کمانڈر رہا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ:

> اس لیے سنہ ۲۰۰۰ء میں یمن میں گائیڈڈ میزائل کو تباہ کرنے والے تباہ کن جہاز کول (Cole) پر القاعدہ کے حملے کی اجازت دی جاسکتی ہے اسی طرح پٹھاگان جیسے کمانڈ سینٹرز پر بھی حملوں کی اجازت ہوگی۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر دہشت گردوں کے لیے زیادہ مناسب اصطلاح "غیر قانونی جنگجو" نہیں بلکہ "مجرم" ہے جسے امریکی طویل عرصے سے استعمال کررہے ہیں۔

دیکھیں! کیا زمین، آسمان کا فرق ہے۔ جناب والا! میں یہ بات کہنا چاہتا ہون کہ ان پروفیسروں نے اس پوری بحث کا جو نتیجہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح کے کیس ۹/۱۱ کے سالوں میں یہ واضح کرتے ہیں:

> جناب چیئرمین! یہ بہت توجہ سے سننے کی چیزیں ہیں...
>
> دہشت گردوں کے خلاف بش انتظامیہ کے طرز عمل نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے کہیں زیادہ مشکلات پیدا کردی ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ دہشت گرد جنگجوؤں کے بجائے دور جدید کے قزاقوں کی طرح ہیں۔ ان کا پیچھا کرکے، ان پر مقدمہ چلاکر عدالتوں کے ذریعہ سزا دلوانا چاہیے۔ بعض انتہائی صورتوں میں فوجی قوت کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ لیکن "دہشت گرد" خود جنگجو نہیں ہیں۔ یہ گھناؤنے قسم کے مجرم ہیں اور اس حیثیت میں ان سے نمٹنے کے لیے مناسب طریقہ کار اور مقام موجود ہے۔

تو جناب والا! بین الاقوامی قانون کی رو سے جامعہ حفصہ اور لال مسجد کے خلاف یہ آپریشن غیر آئینی، غیر قانونی اور بلاجواز تھا۔

فوج کے استعمال کا جواز: جناب والا! یہاں میں ایک دعویٰ کرنا چاہتا ہوں! میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل ۲۴۴ اور ۲۴۵ کے تحت فوج کا استعمال کب جائز ہوتا ہے؟ اُس وقت جب سول انتظامیہ فیل ہو جائے، جب قانون نافذ کرنے والے شہری ادارے کامیاب نہ ہوں اور جب شہری انتظامیہ فوج کی مدد کے لیے باقاعدہ فوج سے درخواست کرے۔ یہ تین شرائط آئین میں ہیں۔ ان میں سے ایک بھی لال مسجد یا جامعہ حفصہ کے سلسلے میں پوری نہیں ہوئی۔ پولیس اور شہری انتظامیہ جو اس میں شامل تھی وہ حقیقی اتھارٹی ہے۔ لیکن قانون نافذ کرنے والے ان شہری اداروں کو استعمال نہیں کیا گیا جن کا کام تھا کہ وہ اس صورت حال میں اپنا کردار ادا کریں۔ بتایا جائے کہ شہری انتظامیہ نے فوج بلانے کے لیے کب درخواست کی اور کس سے کی؟ آئین کے مطابق حکمرانی صدر کے تحت نہیں ہوتی ہے۔ حکمرانی کا ایک پورا انتظامی ڈھانچہ ہے، جسے نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسی لیے بین الاقوامی قانون کے ساتھ ساتھ میری نگاہ میں پاکستان کے آئین کے تحت بھی یہ ایکشن غیر قانونی، بالائے آئین اور بلاجواز ہے۔

جرم اور سزا میں تناسب کا سوال: میری اگلی گزارش یہ ہے کہ قانون کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ غلطی پر گرفت، جرم پر سزا یا جو بھی تعزیر ہو وہ جرم کے مطابق ہونی چاہیے۔ اگر کسی نے آپ کے سو روپے لے لیے ہیں اور ادا نہیں کیے ہیں تو یہ ایک جرم ہے۔ آپ اس کو بندوق سے مار دیں تو یہ اس سے بڑا جرم ہے۔ اسی طرح قانون نافذ کرنے والی مقتدرہ کے لیے بھی طاقت کا استعمال صرف اس وقت جائز ہے جب وہ قانون کے تحت جائز ہو اور اس میں طاقت کا استعمال اتنا ہو جو کم سے کم ہو۔ کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال ایک جرم بلکہ قابل تعزیر جرم ہے۔ صرف شہری قانون میں ہی نہیں، ملٹری میں بھی۔

آپ کو معلوم ہے امریکی فورسز کا بحیثیت مجموعی رویہ ظالمانہ اور غاصبانہ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی چاہے وہ اشک شوئی کے لیے ہو، کتنے ہی کیسز ایسے ہیں، جن میں اس بنا پر کہ ایک آفیسر نے طاقت کا غیر ضروری استعمال کیا، ان پر مقدمہ کیا گیا ہے اور انہیں سزا دی

گئی ہے۔ یہ فوج کا قانون ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ جامعہ حفصہ کی انتظامیہ اور طلباء کی غلطی اور سزا میں کیا نسبت ہے؟ کیا اس سے بڑی کوئی ناانصافی ہو سکتی ہے کہ آپ ان طالبات کی بچکانہ سی حرکتوں کے لیے کمانڈو فورس استعمال کریں؟ آپ عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں، آپ جامعہ حفصہ کو ایک ملبہ کا ڈھیر بنا دیں، آپ سینکڑوں ہزاروں افراد کو قتل کر دیں اور مدرسہ کو اس طرح جلا دیں کہ مرنے والوں کی لاشیں بھی سلامت نہ ہوں۔ جناب والا! کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ تیسرا بڑا جرم ہے۔ عدل کا اس سے بڑا سقوط پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتا اور امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں بھی شاید ہی اس کی مثال ملے گی۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے غیروں کو خوش کرنے کے لیے، امریکہ کی نگاہ میں اپنا اعتبار پیدا کرنے کے لیے اور جو پریشر ان پر ڈالا جا رہا تھا، اسے کسی طریقے سے ہلکا کرنے کے لیے یہ خونی ڈرامہ کھیلا۔ یہ تیسرا بڑا جرم ہے جناب والا! جو کیا گیا ہے۔

مقدسات کی توہین: چوتھی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں جناب والا! کہ یہ سارا عمل غیر اخلاقی بھی ہے بلکہ میں اس سے بھی آگے بڑھوں گا کہ یہ عمل توہین مقدسات (Blasphemous) ہے؟ Blasphemy نام ہے کسی مقدس ہستی، کسی مقدس جگہ کا، یا کسی مقدس اقرار سے انحراف کا۔ آپ نے مسجد کی بے حرمتی کی ہے۔ آپ نے ایک مدرسے اور اس کے دینی کتب خانے کی بے حرمتی کی ہے۔ آپ کے اس فوجی ایکشن میں قرآن پاک شہید ہوا ہے اور اس کے جلے اور پھٹے ہوئے اوراق ملبے سے ملے ہیں۔ اگر یہ واقعہ کسی اور جگہ ہو تو دنیا میں آگ لگ جاتی ہے۔ لیکن اگر لال مسجد اور جامعہ حفصہ پر ہمارے فوجیوں کے ہاتھوں یہ ہوا تو کیا ہم ٹھنڈے دلوں برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اسے بھول سکتے ہیں؟ جناب والا! یہ ناموس کی توہین ہے۔ جس طرح کی بچیوں کی داستانیں میں بی بی سی پر سنتا رہا ہوں وہ نہایت شرمناک ہیں۔ میرے پاس دسیوں رپورٹیں موجود ہیں اور جو سینکڑوں بچے وہاں سے نکلے ہیں، ان سے بھی آپ معلومات لے سکتے ہیں۔ تو جناب والا! یہ سارا عمل غیر اخلاقی اور مسجد و مدرسہ کی بے حرمتی ہے۔

بدنیتی اور غلط بیانی پر مبنی اقدام: پانچویں تنقید میری یہ ہے کہ پورا آپریشن بدنیتی پر مبنی ہے۔

جو چیز اسے سب سے زیادہ گھناؤنا، افسوس ناک اور شرمناک بناتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کام محض امریکہ کو خوش کرنے کے لیے اور نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کی ان کی حکمت عملی، جسے ہم نے بلا سوچے سمجھے اپنے پر مسلط کر لیا ہے کے تحت کیا گیا ہے۔ آج جو بات آپ کابل میں جرگے کو سنا رہے ہیں خود اپنے کو بھی سنا لیجیے۔ خود اپنے ملک میں آپ اس کے خلاف کیا کر رہے ہیں؟ میرے پاس جناب والا! پچیسیوں حوالے موجود ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ مغربی میڈیا نے سب سے پہلے کس طرح اس واقعے کو بھوت بنایا اور اس کے ذریعے ایک فضا پیدا کی کہ یہ بغاوت، سرکشی اور سول وار ہے، تم جواباً اقدام کیوں نہیں کرتے ہو؟ قوت کا استعمال کرو۔ اس طرح ساری فضا بنائی گئی اور اس کے بعد جب مذاکرات ایک مرحلے پر پہنچے تو انہیں سبوتاژ کر کے، چشم زدن میں قوت کا استعمال کر کے معصوم خون بہایا گیا تو اس کے بعد ان کی جانب سے آپ کو داد مل گئی۔

آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلا تحسینی ٹیلی فون برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن (Gordon Brown) نے کیا تھا کہ آپ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کے بعد چار بیان امریکہ کے تین اہم افراد کے آئے۔ اس کے بعد مغربی میڈیا کو آپ دیکھ لیجیے۔ اس کے برعکس جیسا کہ میں نے آپ کو ڈاکٹر مسعودہ بانو کا حوالہ دیا، اسی طرح نیویارک ٹائمز میں لال مسجد پر ایک مضمون آیا اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم گئے ہیں، ہم نے انٹرویو کیے ہیں، ہمیں اس میں کوئی خطرہ نظر نہیں آیا۔ لیکن یہاں دعویٰ کیا گیا کہ وہاں پر سرنگیں تھیں۔

سوال یہ ہے کہ اب وہ سرنگیں کہاں غائب ہو گئیں؟ دعویٰ کیا گیا کہ وہاں پر خودکش بمبار تھے، وہ خودکش بمبار کہاں چلے گئے؟ دعویٰ کیا گیا کہ ان کے پاس راکٹ تھے، وہ راکٹ کہاں چلے گئے؟ شور مچایا گیا کہ ان کے پاس اسلحہ تھا، جبکہ حقیقت میں صرف سترہ کلاشنکوفیں ان کے پاس تھیں جن کے بارے میں انہوں نے علی الاعلان کہا کہ ہمارے پاس ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ آپ نے بعد میں اسلحہ کی جو نمائش کی ہے اس کے بارے میں مغربی میڈیا کے اخبارات پڑھ لیجیے، میں نے پڑھے ہیں کوئی ایک ایسا اخبار نہیں جس نے اس کے اوپر

شک کا اظہار نہ کیا ہو۔ پھر میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے جو اسلحہ بعد میں دکھایا ہے اگر ان کے پاس تھا تو بتایئے کہ انہوں نے استعمال کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اتنے بے وقوف تھے کہ جب ان کے پرخچے اڑائے جارہے تھے اور جنگ کی سی حالت تھی، وہ پھر بھی یہ اسلحہ لیے بیٹھے رہے۔ آپ کو تحفہ دینے کے لیے۔ اور خدا کی قسم اگر ان کے پاس یہ اسلحہ تھا اور انہوں نے استعمال نہیں کیا تو میں کہتا ہوں کہ وہ انسان نہیں فرشتے تھے۔ درحقیقت جس طریقے سے آپ نے ان کو مارا ہے تو یہ سارے کا سارا ایک ڈھونگ اور دھوکہ ہے۔

کیا کیا جائے؟

جناب والا! اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ان پانچ بنیادوں پر یہ ہماری تاریخ کا تاریک ترین سانحہ ہے اور اس کو اس طریقے سے برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ یہ اب تاریخ کا حصہ ہے تو اس کی غلط فہمی ہے اس لیے جناب والا! میں یہ مطالبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایک آزاد عدالتی کمیشن قائم ہو۔ خود سپریم کورٹ کے جو اشارات آئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سپریم کورٹ نے اس کا نوٹس لیا تھا، سپریم کورٹ کی ہدایات میں یہ چیز شامل تھی کہ اس کا پرامن حل نکالو۔ سپریم کورٹ نے قرآن پاک کی بے حرمتی اور بچیوں کے قتل کا بھی نوٹس لیا ہے۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ فی الحقیقت کتنے افراد وہاں مارے گئے ہیں۔

جناب والا! آپ کو معلوم ہونا چاہیے اور میں بڑے دکھ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ بھاری توپ خانے کے علاوہ، جس نے پوری عمارتوں کو تباہ کر دیا، سفید فاسفورس اور زہریلی گیس دونوں کا استعمال ہوا ہے۔ بین الاقوامی انٹرنیٹ پر جلی ہوئی لاشوں اور تباہ ہوئی دیواروں کی ایک نہیں کئی تصویریں موجود ہیں۔ میں نے وہ خود بھی دیکھی ہیں، جن کے بارے ماہرین نے کہا ہے کہ یہ سفید فاسفورس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اور اگر سفید فاسفورس اور زہریلی گیس استعمال کی گئی ہے اور اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے تو یہ انسانیت کے خلاف، اسلام کے

خلاف اور پاکستان کے خلاف جرم ہے۔ جو لوگ بھی اس کے ذمہ دار ہیں ان کو اس کی قرار واقعی سزا ہونی چاہیے۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ ایک آزاد عدالتی کمیشن قائم ہو جو سپریم کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہو۔ میرے خیال میں اس کمیشن کو کم از کم تیرہ سوالات کی جانچ کرنا چاہیے اور طے کرنا چاہیے کہ ان حوالوں سے حقیقت کیا ہے۔ پھر جس کا جتنا جرم ثابت ہو خواہ علماء کا ہو، طلباء کا ہو، فوج کا ہو، سول انتظامیہ کا ہو، کابینہ کا ہو، صدر صاحب کا ہو، اس کا اظہار ہونا چاہیے۔

سوال ۱۔ یہ ہے کہ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کی انتظامیہ اور طلبہ و طالبات پر جو الزامات لگائے جا رہے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ حالات کو اس مقام تک لانے میں کون کون سی قوتیں کس درجے میں شریک تھیں؟ ایک ایک کا کردار اور رول بالکل کھل کر سامنے آئے۔

سوال ۲۔ جنوری ۲۰۰۷ء سے پہلے کوئی مسئلہ کیوں پیدا نہیں ہوا اور وہ کیا خاص حالات اور اسباب ہیں جن کی وجہ سے جنوری سے جولائی تک مختلف واقعات رونما ہوئے؟

سوال ۳۔ انتظامیہ اور طلبہ و طالبات کی اصل شکایات کیا تھیں اور ان کو رفع کرنے کے لیے کیا کیا گیا؟

سوال ۴۔ انتظامیہ اور طلبہ و طالبات سے کیا غلطیاں سرزد ہوئیں اور حالات کی اصلاح اور افہام و تفہیم کے ذریعے معاملات کو طے کرنے کی کیا کوششیں ہوئیں؟ کیا معاہدے ہوئے؟ کس نے ان معاہدوں کو سبوتاژ کیا اور مصالحت کا عمل کیوں کامیاب نہ ہوا؟

سوال ۵۔ اس پورے معاملے میں حقیقی تشدد کا کتنا حصہ ہے اور کون اس کا ذمہ دار ہے؟

سوال ۶۔ کیا حکومت کے پاس کوئی مذاکراتی حکمت عملی اور اختیار تھا؟ اور کیا عالمی تجربات کی روشنی میں قوت کے استعمال کے بغیر مسئلے کا حل ممکن نہیں تھا؟ اگر ایسا تھا تو کیا

ضروری حد تک قوت کا استعمال ہوا یا قوت کا بے رحمانہ، بے محابہ اور سفاکانہ استعمال کیا گیا؟

سوال۷۔ یہ سوال بھی اہم ہے کہ قوت کے استعمال کے لیے جس دستوری اور قانونی جواز کی ضرورت ہے، وہ پورا کیا گیا؟ اسلام آباد میں سول اتھارٹی کون ہے؟ پولیس کے ذریعے مسئلے کو کیوں حل نہیں کیا گیا؟ پولیس اور رینجرز کو کئی مہینے اسلام آباد کس اتھارٹی کے تحت لایا گیا اور ان کو کیوں واپس کیا گیا؟ آخری فوجی آپریشن کا فیصلہ کس نے کیا اور کس دستوری اختیار کے تحت کیا گیا؟ اس میں سول انتظامیہ، کابینہ، چیف آف آرمی اسٹاف ہر ایک کا کیا کردار ہے؟

سوال۸۔ سپریم کورٹ کے بینچ نے مفاہمت کے ذریعے مسئلے کے حل کے لیے ہدایات جاری کی تھیں، ان کا کیا بنا؟ عدالت کا کیا رول رہا اور انتظامیہ نے عدالت کے احکام کے الفاظ اور اور spirit کی کہاں تک پیروی کی؟

سوال۹۔ مسجد اور مدرسے میں موجود افراد اور اسلحے وغیرہ کے بارے میں حکومت کے دعوے کیا تھے اور حقیقت کیا نکلی؟ فوجی آپریشن کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ کہاں تک ضروری تھا؟ جانی اور مالی نقصان کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟ فی الحقیقت کتنے اساتذہ، طلبہ اور طالبات اور دوسرا عملہ مسجد و مدرسے میں تھا؟ کل اموات کتنی ہوئیں، قرائن و شواہد بتاتے ہیں کہ طالبات، طلبہ اور اساتذہ کو اس سے کہیں زیادہ تعداد میں قتل کیا گیا جتنی تعداد حکومتی ترجمان بتاتے ہیں۔ اس قتل عام کی باقاعدہ اعلیٰ سطحی تحقیقات ہونی چاہییں۔

سوال۱۰۔ فوج نے جو ہتھیار استعمال کیے، وہ کون کون سے تھے؟ مدرسے کے طلبہ کی طرف سے کون سے ہتھیار استعمال ہوئے؟ انٹرنیٹ پر موجود مضامین اور روزنامہ ''ڈان'' مین شائع ہونے والی تصاویر میں سفید فاسفورس کے سفاکانہ استعمال کے

شواہد کی کیا حقیقت ہے؟ کیمیائی اسلحے کے استعمال کا کس نے حکم دیا تھا؟ عمارت کے اندر آگ لگنے، لاشوں کے جھلسنے اور اس کے اسباب کا تعین ضروری ہے، نیز کس قسم کی گیسوں کا استعمال اس آپریشن میں کیا گیا اور ان کے کیا اثرات رونما ہوئے؟

سوال ۱۱۔ جس اسلحے کی نمائش کی گئی، اس کی حقیقت کیا ہے؟

سوال ۱۲۔ مسجد میں طلبہ اور طالبات کو یرغمال بنائے جانے کے دعوے کی کیا حقیقت ہے؟ محاصرے کے دوران علماء صلح کاروں اور میڈیا کے نمائندوں کو مسجد اور مدرسے میں جانے سے کس نے روکا؟ آپریشن کے بعد بھی دو دن مسجد اور مدرسے میں میڈیا کو داخل ہونے سے کیوں روکا گیا؟ اس دوران اندر کیا کچھ ہوا ۴۰۰ کفن منگوانے کے بعد صرف ۹۲ لاشوں کی تدفین کا معمہ کیا ہے؟ بی بی سی کے نمائندے کو گورکن نے بتایا کہ ایک، ایک قبر میں دو، دو لاشیں ہیں۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟

سوال ۱۳۔ مسجد کی بے حرمتی، قرآن پاک اور دینی کتب کی بربادی اور مسجد میں جوتوں سمیت جانا اور فوجی ترجمان کا یہ دعویٰ نشر کرنا کہ آپریشن کے دوران اس جگہ کی حیثیت مسجد کی نہیں رہی، کہاں تک صحیح ہے؟ قرآن پاک کے جلائے جانے اور قرآن کے اوراق کی بے حرمتی کے بارے میں سپریم کورٹ کے بینچ نے بھی سوال اٹھائے ہیں۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور سلسلے میں سارے حقائق قوم کے سامنے آنے چاہییں۔

جناب والا! یہ وہ ۱۳ سوال ہیں جن کے جواب آنے چاہییں۔ یہ ایک عوامی مسئلہ ہے۔ یہ قانونی اور آئینی مسئلہ ہے اور میں یہ آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ پوری پاکستانی قوم ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ سوگوار ہے۔ وہ یہ سوال پوچھ رہی ہے اور ان کا جواب دینا ہمارا فرض

ہے۔ اگر ہم ان کا جواب نہیں دیتے تو اس کے معنی ہیں کہ ہم مجرم ہیں اور ہم ایک جرم پر خاموشی یا پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جناب والا! آخر میں، میں یہ کہوں گا کہ ٹھیک ہے، ان شاءاللہ یہ قوم خون اور جرم اور قرآن کی بے حرمتی کا یہاں بھی حساب لے گی لیکن ایک عدالت اس سے بھی بڑی ہے۔ ہم سب نے ایک دن مر جانا ہے۔ خدا کے لیے ایک لمحہ اپنے ضمیر اور اپنے سینے میں جھانک کر دیکھیے اور غور کیجیے کہ آپ نے کیا کیا۔ جو کام جنرل ڈائیر نے برطانوی استعمار کے لیے کیا تھا اس سے برا کام آپ نے اپنی قوم کے ساتھ کیا ہے۔ جو رنجیت سنگھ کے فوجیوں نے بادشاہی مسجد میں کیا تھا آپ نے اسلام آباد میں اس سے زیادہ برا کام کیا ہے۔ خدا کے لیے سوچیے! قوم کے سامنے اور اس سے آگے بڑھ کر آپ اللہ کے سامنے کیا جواب دیں گے؟

(۱۳ اگست ۲۰۰۷ء)

سوات آپریشن اور اندرون ملک بے گھر افراد کا مسئلہ

جناب چیئرمین! سوات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے نتیجے میں اندرون ملک بے گھر افراد کا ایک بڑا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک قومی اور انسانی مسئلہ ہے اور بحیثیت مسلمان یہ ہمارے لیے اسلامی نقطہ نظر سے بھی ایک مسئلہ ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ حکومت، اپوزیشن اور پارٹی ترجیحات کی بجائے اس پر قومی مسئلے کی حیثیت سے غور کیا جائے۔

پہلی بات جو میں کہنے پر مجبور ہوں وہ یہ ہے کہ حکومت نے ماضی کی حکومتوں کی طرح قومی معاملات میں سینیٹ کو نظر انداز کیا ہے۔ اس مسئلے پر قومی اسمبلی میں گفتگو ہوئی اور وہاں سیاسی پارٹیوں کو بریفنگ دی گئی لیکن سینیٹ کو نظر انداز کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ رویہ غلط ہے اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور میں خصوصیت سے لیڈر آف دی ہاؤس سے اپیل کروں گا کہ وہ پارٹی مفادات سے بلند ہو کر حکومت سے بات کریں کیونکہ وہ اس ایوان کے حقوق کے محافظ ہیں۔ اسی طرح جناب چیئرمین! آپ بھی اس ایوان کے حقوق کے محافظ ہیں اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ حکومت کو متوجہ کریں، احتجاج بھی کریں اور آئندہ کے لیے یقینی بنائیں کہ یہ طرز عمل تبدیل ہو۔ جو بھی قومی مسئلہ ہو قومی اسمبلی کے ساتھ ساتھ سینیٹ کو فوری طور پر بلایا جائے، یہاں غور کیا جائے اور سینیٹ جو سفارشات دے ان کو قرار واقعی اہمیت دی جائے۔

جناب والا! دوسری جانب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ حکومت کی پالیسی کون بنا رہا ہے۔ آیا وہ مخلوط حکومت جس کے بارے میں دستور کے تحت کہا جا رہا ہے کہ وہ اس وقت ذمہ دار ہے! لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس مخلوط حکومت میں سے ایک پارٹی کوئی اور بات

کہہ رہی ہے، دوسری پارٹی کوئی اور بات کہہ رہی ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی کے سینیٹر، حالانکہ وہ صوبے اور وفاق میں حکومت میں شریک ہیں، مجبور ہو رہے ہیں کہ اس ایوان میں اور پبلک پلیٹ فارم پر احتجاج کریں۔ یہی صورت جمعیت علماء اسلام کی ہے۔ اگر صوبائی اور مرکزی کابینہ ان معاملات کو نمٹا رہی ہے اور حکومت میں شریک یہ جماعتیں اس پالیسی کے بنانے میں شریک ہیں تو پھر احتجاج کیا معنی۔ اور اگر کابینہ پالیسی نہیں بنا رہی تو کون بنا رہا ہے؟ یہ حکمرانی کا بڑا بنیادی مسئلہ ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جناب والا! اگلی بات یہ ہے کہ سوات کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ فریقین کے درمیان یہ ساتواں معاہدہ ہوا ہے۔ تقریباً اڑھائی سال سے مذاکرات اور معاہدات کا یہ سلسلہ جاری ہے جو ۲۰۰۶ء سے شروع ہوا ہے جبکہ اس علاقے کے اندر کشمکش کا آغاز ۲۰۰۴ء سے ہوا ہے۔ اس کے باوجود لگتا یہ ہے کہ ہم نے نہ اپنے تجربات سے کوئی سبق سیکھا ہے اور نہ پارلیمنٹ کی رہنمائی کو کوئی اہمیت دی ہے۔

پارلیمنٹ کی قرارداد اور حکومتی حکمت عملی: جناب والا! اس پارلیمنٹ نے ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو ایک متفقہ قرارداد پاس کی تھی[1]۔ وہ قرارداد بڑی جامع ہے اور ایک مربوط جامع حکمت عملی پیش کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پارلیمنٹ کی جو کمیٹی قومی سلامتی پر بنائی گئی تھی اس نے مارچ میں اپنا کام مکمل کر کے اپریل میں عمل درآمد کے لیے ۱۴ نکات پر مبنی ایک رپورٹ پیش کر دی تھی۔ لیکن مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت ہو یا صوبائی حکومت، پارلیمنٹ کی اس رہنمائی کو نظر انداز کر کے اس کے برعکس اقدام کر رہے ہیں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ بیرونی دباؤ کے تحت کیا جا رہا ہے جس نے اس پورے معاملے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر اب بھی ہم نے ہوش کے ناخن نہ لیے اور اس سلسلے میں جو ایک حقیقی نقطہ نظر ہو سکتا ہے اسے اختیار نہ کیا تو یہ مزید بگڑ رہا ہے اور خدانخواستہ مزید بگڑے گا۔

---

[1] متفقہ قرارداد کا مکمل متن تقریر کے اختتام صفحہ نمبر ۱۰۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔

جناب چیئرمین! میں آپ کو اس طرف بھی متوجہ کروں گا کہ اس قرارداد میں سب سے پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ مسئلے کی جڑ ہماری تین بنیادی خامیاں ہیں جنہیں دور کرنا ضروری ہے۔ پہلی ہماری خارجہ پالیسی ہے جو پرویز مشرف کے زمانے میں پاکستان سے زیادہ امریکہ کے مفاد کی پالیسی بن چکی ہے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ اس پر نظر ثانی کر کے ایک حقیقی آزاد پالیسی کی ضرورت ہے۔ دوسری دہشت گردی کی جنگ، جس کے بارے میں قرارداد میں صاف کہا گیا ہے کہ ہمیں اپنی حکمت عملی اور اس پر عمل درآمد کے طریقوں پر مکمل نظر ثانی کرنی چاہیے۔ تیسرا پاکستان کا سیکورٹی کے بارے میں مجموعی زاویہ نظر (Paradigm) ہے جس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں چوتھا اصول یہ پیش کیا گیا ہے کہ قوت کا استعمال حل نہیں ہے۔ قوت کے استعمال کی دھمکی اور امکان جسے Deterrent کہا جاتا ہے، اسے Deterrent رہنا چاہیے Operational نہیں۔ اصل چیز مذاکرات اور سیاسی حل ہے۔ حکومتی رٹ محض ڈنڈے کا نام نہیں ہے، یہ قانون کی حکمرانی اور دستور کے مطابق کام کرنے کا نام ہے۔ انتظامیہ کا جو ڈھانچہ بنایا گیا اس کے مطابق نظام کو لے کر چلنے کا نام ہے، آپ محض گولے برسا کر یہ کام نہیں کر سکتے۔

قرارداد میں ایک بڑی بنیادی بات یہ بھی کہی گئی تھی جس کو نظر انداز کیا جا رہا ہے کہ اس عمل کے اندر تمام متعلقہ قوتوں (Stakeholders) کو جوڑنا ضروری ہے یہ بڑا بنیادی نکتہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم کس سے بات کریں، کیا دہشت گردوں سے؟ لیکن جناب والا! میں نے اس سے پہلے بھی کہا ہے اور آج بھی کہتا ہوں کہ جہاں ہم نے ہر دہشت گردی کی مذمت کی ہے، خواہ وہ طالبان نے کی ہو یا حکومت اور یا کسی اور فرد یا گروہ نے، لیکن جب تک آپ مسئلے کی صحیح صحیح تشخیص نہیں کرتے اس کا حل ممکن نہیں۔ آج کے طالبان کیا ہیں؟ کون طالب ہے اور کون طالب نہیں ہے؟ طالبان کے نام پر کون کون سرگرم رہا ہے؟ جب تک آپ ان تمام چیزوں کا صحیح صحیح تجزیہ کر کے کوئی پالیسی نہیں بنائیں گے اس وقت تک مسئلہ نہیں سلجھے گا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ تمام متعلقہ گروپوں سے معاملہ کیا جائے۔ رہی یہ بات

ہے کہ جس کے پاس بندوق ہے اس سے ہم بات نہیں کریں گے، یہ ایک غیر حقیقی بات ہے اس لیے کہ دنیا میں جہاں بھی قوت کا استعمال ہوا ہے تو جو افراد قوت کا استعمال کر رہے ہیں، بات انہی سے کی جاتی ہے۔ کیا کینیا میں جو موکنیاٹا (Jomo Kenyatta) کے ساتھ بات نہیں کی گئی؟ کیا ساؤتھ افریقہ میں اے این سی سے بات نہیں کی گئی؟ کیا جنوبی افریقہ کے سابق صدر نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) کو ستائیس سال تک دہشت گرد نہیں قرار دیا گیا تھا؟ کیا انگلستان میں آئی آر اے کی قیادت جو بندوق تھامے ہوئے تھی اور اٹھارہ سال سے خون بہا رہی تھی، ان سے بات نہیں کی گئی؟ تو آپ محض گھسے پٹے دلائل نہ دہرائیں۔ جو پالیسی حقیقت پسندانہ ہے وہ اختیار کریں۔

امریکہ کی دوعملی: جناب والا! ابھی کل ہی امریکی صدر اوباما نے بڑے طمطراق کے ساتھ تقریر فرمائی ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے کہا ہے کہ مسئلہ کا کوئی فوجی حل نہیں ہے۔ لیکن بار بار کا تجربہ ہے کہ وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ ان کا عمل یہ ہے کہ پاکستان میں جب بھی مذاکرات کے ذریعے معاملات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی تو امریکہ نے اسے سبوتاژ کیا۔ مثال کے طور پر پہلا معاہدہ اپریل ۲۰۰۴ء میں شکئی میں ہوا اور اس کی سیاہی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ امریکہ نے باجوڑ پر حملہ کر کے شکئی معاہدے کے فریق نیک محمد کو اپنے پہلے ڈرون حملہ کے نتیجہ میں ۱۸ جون ۲۰۰۴ء کو ہلاک کر دیا۔ یوں اس معاہدے کو سبوتاژ کر دیا گیا۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا ہے۔ جناب والا! میں صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ بظاہر عوامی نیشنل پارٹی کی حکومت نے سوات کے معاملات سنجیدگی سے حل کرنے کی کوشش کی کہ کوئی راستہ نکل آئے لیکن ان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ ایک طرف انہوں نے تمام گروپوں کو شامل کرنے کے بجائے صرف ایک فرد پر بھروسہ کیا یعنی علاقے میں اثر رکھنے والی مختلف جماعتوں اور شخصیات کو شریک معاہدہ نہیں کیا اور دوسری طرف انہوں نے جو معاہدہ کیا، وہ دوطرفہ اعتماد میں کمی کا شکار ہوا۔

جہاں تک نظام عدل کے نفاذ کا مسئلہ ہے، یہ نیا مسئلہ نہیں ہے، یہ پرانا مسئلہ ہے اور

اس کو وہاں کے آج کے حالات میں گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے پہلے ہی نافذ ہو جانا چاہیے تھا، اگر اب نافذ ہو گیا ہے تو بہت اچھا ہوا، اسے قائم اور نافذ ہونا چاہیے لیکن آپ نے کیا راستہ اختیار کیا۔ ایک طرف آپ نے معاہدہ کیا اور دوسری طرف صدر صاحب اس معاہدے پر آٹھ ہفتے بیٹھے رہے، انہوں نے اس پر دستخط نہیں کیے اور آپ جانتے ہیں کہ جب تک کسی قانون کے مسودے پر دستخط نہ ہو جائیں اس وقت تک وہ قانون نہیں بنتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ آٹھ ہفتے یعنی دو مہینے ایک گومگو کی کیفیت رہی اور عوام اور معاہدہ کے دوسرے شریک شکوک وشبہات میں رہے۔ پھر جس وقت دستخط ہوئے تو آپ یہ دیکھیے کہ دنیا میں کیا شور مچایا گیا، حتٰی کہ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے سرعام یہ بات کہی کہ پاکستانی عوام اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ سارا دباؤ استعمال کیا گیا ہے۔ میری نگاہ میں معاہدہ جو سبوتاژ ہوا ہے اس میں طالبان کی غلطیاں بلاشبہ ہیں لیکن اس سے زیادہ بڑی غلطی مرکزی حکومت اور امریکہ کی ہے۔ نتیجتاً جو کچھ ہوا بیرونی دباؤ کے تحت ہوا ہے، جس سے امن و امان اور مہاجرت کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔

فوجی آپریشن کی ناکامی اور اس کے اثرات: میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ فوجی آپریشن کی ناکامی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور نہیں کہ اس کے نتیجے میں مجرموں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں معصوم بھی مارے گئے ہیں۔ شہر اور گاؤں ہی نہیں، شہری علاقے اور بنیادی ڈھانچہ بھی تباہ ہوا ہے۔ ۳۰ سے ۳۵ لاکھ افراد خود اپنے ملک میں بے گھر ہو گئے ہیں۔ آپ اس آپریشن کی انسانی قیمت دیکھیے، اس کا کوئی مداوا ممکن ہی نہیں۔ پھر اس کی معاشی قیمت دیکھیے، ایک دن کے فوجی آپریشن پر آپ کا کروڑوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب لوگ کھڑی فصلیں، باغات اور مال مویشی چھوڑ کر آئے ہیں۔ جو لوگ آئے ہیں اب ان کی امداد کرنے کا مسئلہ ہے۔ آپ نے فی خاندان جس قدر امداد کا وعدہ کیا ہے تو اندازہ ہے اس کے لیے گیارہ ارب ۲۵ کروڑ روپے درکار ہیں۔ آپ واپسی پر مزید اتنا ہی دینا چاہتے ہیں تو اس رقم کو دوگنا کر لیجیے۔ اس طرح اس کے لیے آپ کو ۲۲ ارب ۵۰ کروڑ روپے دینے ہوں گے۔

اس دوران ان کو ٹھہرانے کے لیے بے پناہ اخراجات درکار ہوں گے۔ کیا حکومت نے یہ فنڈز فراہم کیے ہیں؟ کیا آپ کو اندازہ نہیں تھا کہ کس پیمانے پر یہ ہجرت ہو گی؟ آپ نے خود اعلان کیا کہ گھروں کو چھوڑ دو لیکن ان کا استقبال کرنے کا، ان کو امداد اور ذرائع نقل و حمل فراہم کرنے کا اور سب سے بڑھ کر ان کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ کیسی حکومت اور کیسے آداب حکمرانی ہیں؟ یہ کیا صورتحال ہے؟ آپ خود ذمہ دار ہیں اس پوری صورتحال کے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے فوجی آپریشن کی کل بھی مخالفت کی تھی، آج بھی مخالفت کر رہے ہیں اور ہمیشہ مخالفت کریں گے۔

ہمارا مطالبہ ہے کہ فوجی آپریشن جلد از جلد ختم کیا جائے۔ حکومت کی رٹ ہم بھی چاہتے ہیں لیکن حکومت کی رٹ کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہاں کے نظم و نسق کے لیے، وہاں کا روایتی نظام، مقامی پولیس، لیوی اور وہاں کے اسکاؤٹس کو منظم و متحرک کیا جائے۔ ان اداروں کے ساتھ وہاں کے علماء، ملک، قبائلی عمائدین اور جرگہ کو مؤثر بنایئے یہ اصلاح احوال کا اصل طریقہ ہے۔ سول اور عدالتی انتظامیہ کے بغیر کسی حکومت کی رٹ قائم نہیں ہو سکتی۔

پھر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ فوجی آپریشن کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، یعنی بمباری اور آرٹلری کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ کوئی فوج، کوئی حکومت اپنے عوام کے خلاف خواہ شورش ہو، خواہ افتراق و علیحدگی ہو یہ راستہ اختیار نہیں کرتی۔ یہ طریقہ صرف امریکہ نے ویت نام میں اختیار کیا تھا اور یا اسرائیل فلسطین میں کر رہا ہے۔ دوسری جانب سری لنکا کی حکومت نے یہی طریقہ اختیار کیا تو مغربی اقوام نے اس کی مذمت کی۔ ذرا آپ غور سے دیکھیے کہ ہمارا اور سری لنکا کا آپریشن ساتھ ساتھ ہو رہا ہے لیکن امریکہ، یورپ اور اقوام متحدہ اس نوعیت کے آپریشن پر سری لنکا کی حکومت کی تو مذمت کرتے ہیں کہ تم دہشت گردوں کے خلاف ہوائی قوت اور فوج استعمال نہ کرو اور ہم سے کہتے ہیں کہ استعمال کرو اور اگر نہیں کرو گے تو ہم تمہارا ناطقہ بند کر دیں گے۔ میری نگاہ میں فوج کو اگر استعمال کرنا ہی تھا تو اس کا راستہ مسلح فورس اور فضائی طاقت نہیں، اس کا راستہ پیادہ اور اسپیشل سروسز

کا استعمال ہے۔ ہم سے آپ کہتے ہیں کہ فوج کی اندرونی بغاوت کا مقابلہ کرنے کی تربیت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکہ آپ کے لوگوں کو تربیت دے گا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ سری لنکا کے وزراء نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے کہا ہے کہ پاکستانی فوج کی مدد، پورے عرصے میں ان کی تربیت اور ان کا دیا ہوا اسلحہ ہم نے اپنے ہاں تامل ٹائیگرز کو قابو کرنے میں استعمال کیا ہے۔ اگر وہاں سری لنکا میں آپ یہ کچھ دے سکتے ہیں تو صلاحیت تو موجود ہے۔ پھر امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلانے اور اپنے در و دیوار ان کے لیے کھولنے کی کیا مصلحت ہے۔ یہ بڑے سنجیدہ سوالات ہیں۔

حکومت پر بے اعتمادی: جناب والا! پھر کرپشن ہے۔ اس وقت بھی جبکہ قوم ایک بحران میں ہے، میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ اس قوم کے پاس وسائل بھی موجود ہیں اور جذبہ بھی موجود ہے لیکن حکومت اور نظام پر اعتماد نہیں ہے۔ سیاسی قیادت اور انتظامیہ دونوں عوام کے اعتماد سے محروم ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں زلزلے کے موقعے پر آپ نے دیکھا کہ کس طرح کراچی سے خیبر تک ہر فرد متحرک ہو گیا۔ لوگوں نے اپنی تجوریاں کھول دیں۔ آج کیوں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ انہیں آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ بیرونی عطیہ دہندگان بھی خفیہ نہیں بلکہ کھلے طور پر صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ ہمیں حکومت پر اعتماد نہیں ہے کہ جس مقصد کے لیے پیسہ دیا جائے اسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس لیے وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اپنی امداد اجناس اور اشیاء کی صورت میں دیں یا وہ خود آ کر متاثرین کو دینا چاہتے ہیں کیونکہ ان کو اس حکومت پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ کیا غضب ہے۔ جب تک آپ کرپشن پر قابو نہیں پاتے، ملک اور ملک سے باہر آپ اعتماد سے محروم رہیں گے۔

خدمت کے عوامی جذبات

جہاں تک عوام کا تعلق ہے وہ اب بھی سوات کے ان متاثرین کی دل کھول کر مدد کر رہے ہیں۔ آپ یہ دیکھیے کہ ۳۵،۳۰ لاکھ افراد میں سے صرف دو لاکھ افراد آپ کے کیمپوں میں

ہیں جبکہ باقی تین ملین افراد وہ ہیں جن کو لوگوں نے اپنے گھروں میں ٹھہرایا ہے۔ جن کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی انہوں نے بھی اپنے گھر کھول دیے ہیں۔ یہ جذبہ تو آج بھی موجود ہے اور عوام پوری طرح تعاون کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ ہاں! ہم مستحقین کی مدد کریں گے یہ پیسہ ضائع نہیں ہو گا۔ الخدمت فاؤنڈیشن اور پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے کارکنان ہر کیمپ اور ہر راستے پر موجود ہیں اور خدمت کر رہے ہیں۔ جماعت اسلامی نے ہر مقام پر مدد کا اہتمام کیا ہے اور اسے بچشم سر دیکھا جا سکتا ہے۔ الحمدللہ ان تین ہفتوں میں کئی ارب روپے نقد، کھانا اور خدمات کی صورت میں پاکستانی عوام نے دیں۔ لیکن ظاہر ہے یہ کسی پر احسان نہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ جن افراد نے سندھ اور کراچی میں ان بے گھر ہونے والے بہن بھائیوں کی آمد پر مسئلہ پیدا کیا، وہ ملک کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ اندرون ملک یہ بے گھر افراد ہمارے شہری ہیں اور ملک کے ہر حصہ پر ان کا حق ہے۔ صرف ان کو ہی نہیں کراچی کے رہنے والے پشتون بھائیوں کو بھی ہراساں کیا گیا ہے۔ کل بھی وہاں پر لوگ مارے گئے ہیں۔ یہ قوم اور ملک کے ساتھ دوستی نہیں دشمنی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ حکومت میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ حرکتیں بھی کر رہے ہیں۔

کیا کیا جائے؟

جناب والا! مجھے وقت کی کمی کا احساس ہے اس لیے مجھے اجازت دیجیے کہ میں صرف چند نکات کے ساتھ اپنی بات کو ختم کر لوں۔

۱) میری نگاہ میں سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ مسئلے کا فوجی حل نہیں ہے اور فوجی آپریشن کو ختم کیا جائے۔

۲) فوری طور پر سیاسی عمل شروع کیا جائے، مذاکرات اور سول انتظامیہ کے ذریعے عوام کو اعتماد میں لے کر جرگہ کے روایتی طریقے کے ذریعے سے اس کام کو سرانجام دیجیے۔

۳) تیسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سوات اور مالاکنڈ میں نظام عدل کے نفاذ کے بارے میں کوئی تساہل نہ کیا جائے اس لیے کہ اس کا تعلق موجودہ حالات سے نہیں ہے۔ یہ نظام وہاں پر لازماً لفظاً اور عملاً متعارف ہونا چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس فیصلہ کے مفید اثرات نکلیں گے۔ اس کے بغیر خلا رہے گا اور اس کے بغیر وہاں کسی نہ کسی شکل میں شورش ہمیشہ جاری رہے گی۔

۴) اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کے ہر شہری کو اپنے تباہ حال بھائیوں، بہنوں، بوڑھوں اور بچوں کی مدد کرنا چاہیے۔ خاص طور پر حکومت کو اپنی شاہ خرچیاں ختم کرنی چاہییں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک ایک وزیر، اس اسمبلی اور سینیٹ کے ہر ممبر پر کتنا روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اخراجات کو کم کریں، مستحقین کی مدد کریں اور انہیں وسائل فراہم کریں۔ میرے اندازے کے مطابق جو نقصان ہوا ہے وہ کم سے کم ڈیڑھ سے دو سو ارب روپے ہے۔ اس میں جانی نقصان شامل نہیں ہے۔ اس کے لیے ہم میں سے ہر ایک کو اپنا حصہ ڈالنا ہو گا۔

۵) ایک اہم بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ متاثرین کی بحالی کے لیے ایک مربوط پروگرام ہونا چاہیے۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے کہ ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے بعد کہا گیا تھا کہ ہم ایک نیشنل ایمرجنسی سیٹ اپ بنا رہے ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی واقعہ ہو گا اس سیٹ اپ کے ذریعہ ہم وہاں فوراً توجہ کریں گے۔ لیکن اس موقع پر معلوم ہوا کہ ایسا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ چنانچہ وزیر اعظم صاحب کو پھر آج ایک ٹاسک فورس بنانی پڑی ہے اور اس کے لیے انہی آزمائے ہوئے اور ناکام افراد کو مقرر کیا گیا ہے جو زلزلے کے بعد کچھ بھی کارکردگی نہیں دکھا سکے تھے۔

۶) میں یہ بھی کہوں گا کہ اس وقت اولین مسئلہ بلاشبہ سوات کے اندرون ملک بے گھر افراد IDPs کا ہے۔ اس کو ہمیں جنگی بنیادوں پر نمٹانا چاہیے۔ لیکن اسی دوران میں بلوچستان کے مسئلے کو نظر انداز کرنا ایک ہمالیائی غلطی ہو گی۔ اس بات کی ضرورت

ہے کہ وہاں کے لوگوں سے جو عہد آپ نے کیا ہے اسے پورا کیجیے محض معذرت کر دینا کوئی حل نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ بلوچستان کے مسائل پر دھیان دیا اور صوبائی خود مختاری کے وعدے کو پورا کیا جائے۔

۷) آخری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سب سے بنیادی مسئلہ افغانستان پر امریکی قبضہ اور ہمارا ان کے ساتھ تعاون ہے۔ جب تک یہ ختم نہیں ہوتا اس علاقے میں امن کا قیام ممکن نہیں۔

(۵جون ۲۰۰۹ء)

پارلیمنٹ کے بند کمرہ مشترکہ اجلاس کے اختتام پر منظور کی گئی متفقہ قرارداد
(۲۲ اکتوبر، ۲۰۰۸ء)

پارلیمنٹ کے اس بند کمرہ مشترکہ اجلاس میں بڑی تشویش سے یہ بات نوٹ کی گئی کہ تشدد پسندی، عسکریت پسندی اور دہشت گردی کی تمام صورتیں اور جہتیں ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔ یہ بات باور کرائی گئی کہ ماضی کے مطلق العنان حکمرانوں کی پالیسیوں کا مقصد قومی مفاد کی قیمت پر اپنے ذاتی اختیارات کو دوام بخشنا تھا۔

اس ایوان نے، اس مسئلے پر جامع اور وسیع پیمانے پر سوچ بچار کی ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں، قوانین کی تیاری، اداروں کی تشکیل، اپنے شہریوں کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے، دہشت گردی کو جڑ سے ختم کرنے، اپنی معیشت میں نئی روح پھونکنے اور نقصانات کی تلافی کے لیے مواقع پیدا کرنے کے لیے ہم سب حسب ذیل کی پابندی کریں گے۔

۱۔ کہ ہمیں اپنی قومی سلامتی کی اسٹریٹجی کا فوری جائزہ لینے اور ایک آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل کے ذریعے خطے اور پاکستان کی سالمیت اور امن قائم کرنے کے لیے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لائحہ عمل پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۲۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی کے خطرات کو تمام اسٹیک ہولڈروں سے مذاکرات کے ذریعے اتفاق رائے پیدا کر کے دور کیا جانا چاہیے۔

۳۔ قوم اس بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے دہشت گردی کی تمام صورتوں اور جہتوں کی عوامی پیغام کے ذریعے سختی سے مذمت کرتے ہوئے بشمول بڑھتی ہوئی فرقہ واریت سے نفرت اور تشدد کو مضبوط ارادہ کے ساتھ نمٹنے اور اس کے بنیادی اسباب کا تدارک کرنے کے لیے متحد ہے۔

۴۔ پاکستان کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کا ہر صورت تحفظ کیا جائے گا۔ قوم اپنے ملک پر ہر قسم کے حملوں اور چڑھائی کے خلاف متحد ہے اور حکومت کے ساتھ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھرپور طور پر تیار ہے۔

۵۔ پاکستان کے علاقے کسی بھی ملک پر کسی بھی قسم کے حملے کے لیے استعمال نہیں کیے جائیں گے اور غیر ملکی جنگجو اگر پائے گئے تو وہ ہماری زمین سے بے دخل کر دیے جائیں گے۔

۶۔ اس وقت آویزش کے انصرام و حل کے اہم ذریعہ کے طور پر مذاکرات کو ان تمام عناصر کے ساتھ اوّلین ترجیح دی جائے گی جو پاکستان کے دستور اور قانون کی حکمرانی کی پابندی کرنے کے لیے رضامند ہیں۔

۷۔ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد (پختونخوا) میں خصوصی طور پر شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کر کے وہاں نئی معاشی سرگرمیوں کے ساتھ امن قائم کیا جائے گا تاکہ کم مراعات یافتہ علاقوں کو پاکستان کے دیگر علاقوں کے برابر لایا جاسکے۔

۸۔ بلوچستان کے لوگوں کی محرومیوں کا ازالہ کیا جائے گا اور وسائل کی دوبارہ تقسیم کے لیے کام کو تیز کیا جائے گا۔

۹۔ مملکت قانون کی حکمرانی قائم کرے گی اور جہاں لوگوں کی جان و مال کا تحفظ یقینی بنانا ہو وہاں پہلے خبردار کیا جائے گا تاکہ آویزش زدہ علاقوں میں بے گناہ جانی نقصان سے بچا سکے۔

۱۰۔ جمہوری عمل، سماجی انصاف، مذہبی اقدار، تحمل اور صوبوں کے درمیان ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق وسائل کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے وفاق کو مضبوط بنایا جائے گا۔

۱۱۔ حکومت شورش زدہ علاقوں میں اپنی عمل داری یقینی بنائے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے مقامی آبادی (جرگہ) اور روایتی اقدامات کے ذریعے اعتماد سازی کا نظام تیار کیا جائے گا اور فوج کو جلد از جلد واپس بلا کر قانون نافذ کرنے والی سول ایجنسیوں کو بہتر استعداد کار کے ساتھ وہاں بھیجا

جائے گا اور پائیدار سیاسی نظام مشاورتی عمل کے ذریعے حاصل کیا جائے گا۔

۱۲۔ مغربی اور مشرقی سرحدوں سے تجارت اور علاقائی امن کے فروغ کے معاملات میں پاکستان کے دفاعی مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔

۱۳۔ داخلی سلامتی کے لیے نظام کو ادارہ جاتی بنایا جائے گا۔ اور جاں بحق ہونے والوں کے لیے معاوضے کی ادائیگی اور گھروں سے نقل مکانی کر جانے والے متاثرین کی جلد واپسی ، ملک بھر میں دہشت گردی کے اثرات، میڈیا اور مذہبی شراکت داری کے ذریعے دہشت گردی کے خلاف عوام کو متحد کیا جائے گا۔

۱۴۔ اس قرارداد میں دیے گئے طریقہ کار اور تیار کیے گئے اصولوں پر عمل درآمد کی نگرانی، رہنمائی کی فراہمی اور وقتاً فوقتاً جائزہ کے لیے پارلیمنٹ کی خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ یہ ایوان اسپیکر کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ دونوں ایوانوں کے پارلیمانی قائدین کے ساتھ مشاورت کر کے مذکورہ کمیٹی تشکیل دیں۔ کمیٹی اپنے قوانین خود اپنے اجلاس میں بنائے گی۔

عافیہ صدیقی کی گرفتاری اور سزا

جناب والا ! میں اس وقت محترمہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا مسئلہ اٹھانا چاہتا ہوں ۔ مجھے معلوم ہے کہ حکومت نے اس معاملے میں اب کچھ دلچسپی کا اظہار کیا ہے لیکن یہ قطعاً ناکافی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اس سوال کا سامنا کرنا ہو گا کہ ایک خاتون اپنے تین بچوں کے ساتھ ۲۰۰۳ء میں پاکستان کی سرزمین پر گرفتار ہوتی ہے۔ دوسری جانب پاکستانی سیکورٹی ایجنسی نے اس کے خاندان کو ضمانت دی کہ پریشان نہ ہوں، وہ ٹھیک ہاتھوں میں ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ وہ جولائی ۲۰۰۸ء میں کابل میں رونما ہوئی ہے اور گن لے کر فوجیوں کو مار رہی ہے۔

ناقابل یقین بات ہے کہ ۹۰ پاؤنڈ وزن کی خاتون اور اس کے مقابلہ میں تین تین مسلح امریکی فوجی موجود ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ خاتون ان پر حملہ آور ہوئی ہے۔ اس کیس کو جس اہمیت کے ساتھ اور جس سطح پر سیاسی اور قانونی سطح پر اٹھانے کی ضرورت ہے اس کا اہتمام کیا جانا ضروری ہے۔

دوسری بات عافیہ صدیقی کے بچوں سے متعلق ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کے بچے اب تک ملے نہیں ہیں۔ جو ایک بچہ ملا ہے، اس کے بارے میں بھی، اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو بڑی افسوسناک ہے کہ چونکہ اس کے بچے کے پاس برطانوی پاسپورٹ ہے، اس لیے پاکستانی حکومت نے اس میں دلچسپی نہیں لی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، جو پاکستانی اصل کے لوگ ہیں، وہ ہمارا جگر گوشہ ہیں اور یہ قومی مسئلہ ہے۔ عافیہ صدیقی کے تینوں بچوں کو تلاش کیجیے اور اس معاملے میں قانونی اور سیاسی، دونوں سطح پر مؤثر کارروائی ہونی چاہیے۔ اس لیے میں آپ کی توجہ ان دونوں مسائل کی طرف مبذول کراتا ہوں۔

میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی حالت کے بارے میں کل کے امریکی اخبارات میں جو رپورٹس میں نے پڑھی ہیں وہ افسوسناک ہیں۔ ان رپورٹس کے مطابق زخمی اور بیمار ہونے کے باوجود وہ اب بھی بروکلین کے ایک پولیس سٹیشن میں ہیں، اور یہ اس کے باوجود ہے کہ ان کے ہاں اس حوالہ سے سنجیدہ قوانین موجود ہیں۔ ان کے وکیل نے مطالبہ کیا ہے کہ ان کو ہسپتال منتقل کیا جائے، لیکن یہ نہیں کیا جارہا۔ جناب والا! ہماری جانب سے عافیہ صدیقی سے صرف رابطے میں ہونا کافی نہیں ہے، اس معاملے میں مزید دلچسپی لیں اور یہ یقینی بنائیں کہ انہیں قانونی اور میڈیکل کی سہولتیں حاصل ہوں۔ (۵ ستمبر ۲۰۰۸ء)

وزیر مملکت برائے خارجہ کی یہ بات تو صحیح ہے کہ سوال وزارت داخلہ سے متعلق تھا لیکن میرا ان سے سوال بنیادی طور پر یہی ہے کہ ۲۰۰۳ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک پورے پانچ سال کا عرصہ ہے اور یہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں تھی۔ اس کے بارے میں پریس میں بھی آرہا تھا اور ہم نے بھی اس مسئلے کو یہاں اٹھایا لیکن ایجنسیوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا ہے کہ عافیہ صدیقی افغانستان کیسے پہنچی؟ اور فیملی کا مؤقف واضح ہے کہ اس کو کراچی سے اغواء کیا گیا ہے اور اغواء کرنے کے بعد پوری کوشش کی گئی کہ حقیقت کو چھپایا جائے۔ کیا وزیر داخلہ یا قائد ایوان اس معاملے میں کچھ کریں گے کیونکہ یہ پانچ سال کا وقفہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ (۱۹ جنوری ۲۰۱۰ء)

۸۶ برس کی سزا

جناب چیئرمین! میں آپ کا، قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کا ممنون ہوں کہ اس اہم موضوع پر سینیٹ میں بحث کو ایجنڈے کا حصہ بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا دن ہمارے لیے سوگ کا، غم کا اور غصے کا ہے۔ کل ایک فیڈرل جج نے امریکہ میں ہماری محترم بہن خاتون پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو سات نام نہاد الزامات کی بنیاد پر ۸۶ سال کی سزا دی ہے۔ ایک جانب یہ ہمارے اور خود امریکہ کے بھی قانونی نظام کی بڑی ناکامی ہے اور دوسری جانب یہ پاکستان، اسلام اور امت مسلمہ تینوں کے خلاف ایک سنگین اقدام ہے۔

معاملہ محض افسوس کا نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر عافیہ کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے بڑے صبر اور تحمل کے ساتھ اس ظالمانہ فیصلے کو سنا اور ہم سب سے اپیل کی کہ کوئی ایسا ردعمل جو تخریبی ہو اختیار نہ کیا جائے بلکہ صبر اور ہمت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے۔ بلاشبہ اس اپیل کے ذریعہ اس خاتون نے ہمارے سامنے ایک بڑی اونچی مثال قائم کی ہے لیکن یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کے خلاف بھرپور احتجاج کریں۔ جو ظلم ہو رہا ہے، یہ میری نگاہ میں تو انسانیت، عام قانون اور بین الاقوامی قانون دونوں کے خلاف ہے اور مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس معاملے میں پاکستان کی حکومتوں کا دامن صاف نہیں ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ عافیہ صدیقی کو اپنے بچوں کے ساتھ اغوا کیا گیا اور پھر اسے امریکیوں کے حوالے کیا گیا۔ بعد ازاں وہ پاکستان سے افغانستان منتقل کی گئی اور وہاں پھر ایک ڈرامہ رچا کر کے اس کو امریکہ لے جایا گیا۔ یہ سانحہ ساری دنیا کے سامنے ہے تاہم اس کے باوجود اس بارے میں غلط بیانیاں کی جارہی ہیں۔ اس موقع پر میں برطانوی خاتون صحافی میڈم ریڈلی (Ridley) کی کوششوں کا اعتراف کروں گا کہ جب افغانستان میں بدنام زمانہ جیل میں اس پر مظالم ہو رہے تھے تو اس نے عافیہ صدیقی کی مظلومیت کے خلاف آواز اٹھائی اور ساری دنیا کے ضمیر کو پکارا۔ دوسری جانب اس ایوان اور قومی اسمبلی نے، عوام اور تمام سیاسی جماعتوں نے اس پورے عرصے میں احتجاج کیا ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ حکومت پاکستان نے بہت ہی عمومی انداز میں اس مسئلے کو لیا ہے۔ وزیر قانون نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہم اس معاملے میں ہر ممکن کارروائی کریں گے۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ دفتر خارجہ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ رہا ہو کر پاکستان آنے والی ہے لیکن یہ سب طفل تسلیاں ثابت ہوئیں اور امریکہ نے وہی کیا جو اس کو کرنا تھا۔ میں امریکہ کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے قانون کو استعمال کیا ہے ناانصافی، اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی کے لیے اور امریکہ کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی ہوگی۔

عافیہ بہن نے بہت صحیح کہا ہے کہ میں نہ امریکہ کی دشمن ہوں، نہ کسی اور کی، میری

مخالفت امریکہ کی پالیسیوں سے ہے اور جب تک یہ پالیسیاں نہیں بدلتیں، پوری دنیا میں امریکہ مخالف تحریک کو فروغ ملے گا اور اس کی خارجہ پالیسی ناکام ہو گی۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری حکومت نے حقیقی طور پر کچھ کرنے کے بجائے محض ڈرامائی کام کیا ہے۔ کیا میں آپ کو یاد نہ دلاؤں کہ برطانیہ کا وزیر اعظم ٹونی بلیئر (Tony Blair) ذاتی طور پر پاکستان آتا ہے اور جنرل مشرف پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ایک ایسے برطانوی شہری کو جو پاکستانی نسل کا تھا، رہا کرا کے لے جاتا ہے۔[1] اس کے برعکس ہم امریکہ کی ہر خدمت انجام دے رہے ہیں اور ہم اپنی قوم کی بیٹی کو جو معصوم ہے، جسے ظلم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اسے واپس نہ لا سکے۔

جناب والا! اس ایوان کو اس معاملے میں قوم کے جذبات کو پوری طرح ظاہر کرنا چاہیے۔ آج ہم باقی کارروائی معطل کر کے اسی مسئلے پر گفتگو کریں۔ پورے ایوان کی طرف سے اس بات کو پیش کیا جائے اور حکومت اس کی رہائی یا اس کی واپسی کو انتہائی اہمیت دے۔ اس کے لیے ہمیں جو بھی کرنا پڑے وہ ہم کریں اور اس کے لیے اگر ہمیں ان سہولتوں کو بھی روکنا پڑے جو ہم نے امریکہ اور نیٹو (NATO) کو اپنے یہاں دی ہوئی ہیں، تو روکیں۔ اگر یہ صورت ہم اختیار کریں تو یہ ہمارا حق بھی ہے اور ہمارا فرض بھی ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لیے محض زبانی جمع خرچ نہیں بلکہ ہمیں قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر نوعیت کا مؤثر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک جانب ہم قانون کی لڑائی بھی لڑیں لیکن یہ سیاسی مسئلہ ہے اور ہمیں سمجھنا چاہیے کہ سیاسی مسئلے کو سیاسی طور پر حل کیا جاتا ہے۔ (۲۴ ستمبر ۲۰۱۰ء)

---

[1] برطانوی اخبار گارجین میں ۲۴ نومبر ۲۰۰۹ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستانی نسل کا برطانوی شہری رنگ زیب اور صلاح الدین امین پر پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے دہشت گردی کے حوالے سے تفتیش کے دوران تشدد کیا۔ ان کی حراست کے دوران برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر پاکستان کے دورے پر آئے تو برطانیہ میں انسانی حقوق کی تنظیموں نے برطانوی حکومت پر الزام لگایا کہ وہ اور اس کی ایجنسیاں پاکستان میں قید برطانوی شہری پر دہشت گردی کے حوالے سے تفتیش کے دوران تشدد کی کارروائیوں میں شریک ہیں۔ گو کہ ٹونی بلیئر نے اس بات کی تردید کی لیکن پاکستانی خفیہ اداروں کے بعض افسران نے میڈیا سے اس بات کی تصدیق کی کہ برطانوی اور امریکی خفیہ ادارے رنگ زیب اور صلاح الدین امین سے دہشت گردی کے حوالے معلومات اگلوانے کے لیے تشدد کے ہتھکنڈوں میں شریک تھے۔ بعد ازاں برطانوی شہریوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔

بے نظیر بھٹو اور دیگر قائدین پر حملے

محترمہ بے نظیر بھٹو دو مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم رہیں۔ پرویز مشرف کے دور حکمرانی کا بیشتر حصہ انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی میں گزارا۔ البتہ مشرف حکومت کے ساتھ قومی مفاہمت آرڈیننس NRO کے بعد ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو وہ واپس کراچی لوٹیں جہاں ایئرپورٹ سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی ان کے جلوس پر حملہ ہوا۔ اس حملہ میں وہ بچ گئیں البتہ چند ہفتے بعد اسی سال ۲۷ دسمبر کو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ کے اختتام پر ہونے والے حملہ میں وہ جاں بحق ہو گئیں۔ زیر نظر مضمون میں دونوں واقعات کے تناظر میں اٹھنے والے سوالات پر گفتگو کی گئی ہے۔

جناب چیئرمین! میں ایک عام آدمی کے حالات کا جائزہ لینے کا ماہر نہیں ہوں، دوسری جانب مجھے سراغرسانی کے علم کا بھی کوئی زیادہ تجربہ نہیں ہے لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ جب حکومت کی جانب سے بار بار یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلاں علاقے میں چھ خودکش حملہ آور داخل ہو گئے ہیں، پھر بتایا جاتا ہے کہ اب ان کی تعداد چار ہے، ان کی شکلیں اور ان کے فون نمبر بھی بتا دیے جاتے ہیں۔ ان معلومات کے باوجود ان کو اقدام سے پہلے پکڑا کیوں نہیں جا سکتا۔ اقدام کا انتظار کیوں کیا جاتا ہے۔ میں اگر عام آدمی کی ترجمانی کروں تو اس کے خیال میں، یا تو حکومت کے پاس درست معلومات نہیں ہوتی ہیں اور یا حکومت جان بوجھ کر اپنی ہی معلومات کو نظر انداز کرتی ہیں۔ کیونکہ اگر یہ معلومات موجود ہیں تو کیا یہ اتنے اشارے فراہم نہیں کرتیں کہ آپ قبل اس کے کہ مجرم کوئی کارروائی کریں حکومت ان پر ہاتھ ڈال سکے۔ یا حکومت اتنی نااہل ہے کہ معلومات کے باوجود بروقت

کارروائی نہیں کر سکتی۔

آپ نے صحیح کہا کہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ محرم کا تہوار ملک میں امن کے ساتھ گزر گیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر حکومت کی مشینری چوکنا ہو، ضروری اقدامات کیے جائیں تو حالات کو قابو کیا جا سکتا ہے۔ یہیں سے یہ پتا لگتا ہے کہ اگر اور جگہوں پر حالات کنٹرول نہیں ہو پا رہے تو لازماً ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم سے کہاں کہاں اور کیا غلطیاں ہوئی ہیں کہ ہم حالات کو قابو نہیں کر سکے۔

بنیادی سوالات: اس حوالے سے میں یہ کہوں گا کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ پر کراچی میں حملہ کا واقعہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھا لیکن اس کی تحقیقات بھی آج تک سامنے نہیں آئی ہیں۔ جو بنیادی سوالات اس وقت سیکورٹی اور انٹیلی جنس کے بارے میں اٹھائے گئے تھے، وہ سوالات ہنوز جواب طلب ہیں۔ اور اب یہ چیز سامنے آ رہی ہے کہ کراچی میں بھی وہی کچھ ہوا تھا جو یہاں راولپنڈی میں موقع واردات کے بارے میں کیا گیا ہے، یعنی شہادتوں کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک منظم طریقہ کار ہے۔

میں انگلستان میں کئی سال رہا ہوں اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آئرش ریپبلکن آرمی (IRA) کے دہشت گرد جگہ جگہ تشدد کی کارروائیاں کرتے تھے۔ دفتر کے آس پاس ایسے واقعات ہوئے جس میں تیس، تیس، چالیس، چالیس افراد ایک عوامی جگہ کے اوپر مار دیے گئے۔ لیکن جناب والا! میں گواہی دیتا ہوں کہ سات، سات، آٹھ، آٹھ دن تک اس پورے علاقے کو اس طرح گھیر لیا جاتا تھا کہ پولیس کی اجازت کے بغیر کسی کو ہاتھ لگانے کا موقع نہ ہوتا۔ جب تک تمام شواہد کو اچھی طرح جمع نہیں کر لیا جاتا معمولات بحال نہیں ہوتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ دنیا میں یہ معروف طریقہ رائج ہے تو آپ کے ہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ کام کراچی میں ہوا اور کراچی کے واقعہ کے بعد اب یہاں پر بھی نہیں ہوا۔ بڑی مستعدی کے ساتھ دو گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ صاف کر دیا گیا۔ اب حکومت کی جانب سے اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ ہم بھی اس کے بارے میں غیر مطمئن ہیں۔ در حقیقت یہ بڑا بنیادی سوال ہے

جس کا جواب بہت سے عقدوں کو کھول سکتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ میں جاننا چاہوں گا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی گاڑی پر فائرنگ کے بارے میں عالمی ذرائع ابلاغ اور پاکستان کے نجی چینلز پر کچھ تصاویر آئی ہیں۔ ان تصاویر میں خاص طور سے ایک شخص کو باقاعدہ فائر کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ ان تمام چیزوں کو کہاں زیر تفتیش لایا گیا ہے۔ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ وزارت داخلہ کے ایک ذمہ دار شخص نے تین مختلف مواقع پر بیانات دیے۔ ابتداً خاص طور پر یہ بات کہی گئی کہ بے نظیر صاحبہ کو گولی نہیں لگی ہے اور جو واقعہ ہوا ہے، وہ لوہے کے کسی ٹکڑے کے لگنے سے ہوا۔ اس بات کو بہت پھیلایا گیا لیکن یہ خود ان کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ کسی ذمہ دار آدمی کا ایسا بیان دینا اور اس کی باقاعدہ تحقیقات نہ ہونا بذات خود قابل گرفت ہونا چاہیے۔ بعد میں تسلیم کرنا پڑا کہ موت گولی لگنے کی بناء پر واقع ہوئی ہے۔ لیکن اس طرح کی غیر ذمہ داری کے خلاف آپ نے کیا ایکشن لیا ہے۔ ان سوالوں کا آپ کو جواب دینا پڑے گا۔ اہم معاملہ تحقیقات کا ہے تو سچی بات یہ ہے کہ قوم کو اعتماد نہیں ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں تحقیقات دی گئی ہیں، وہ دیانتداری اور شفافیت کے ساتھ یہ کام سرانجام دیں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ ہمارے پاس تجربہ کار ماہرین کی کمی ہو۔ اس قوم میں پیشہ وارانہ صلاحیت کے حامل بہت سے تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔ ہمارے ریٹائرڈ ججوں کے اندر ایسے افراد ہیں جن پر سب کا اتفاق ہو سکتا تھا کہ ان کو یہ کام سونپا جائے۔ جہاں تک بین الاقوامی تحقیقات کا تعلق ہے ہم انسانی ہمدردی میں اس بنیاد پر کہ جو چیز بھی پیپلز پارٹی کی قیادت کو مطمئن کر سکے اس پر متفق ہو جائیں گے۔ لیکن ایسے ہی کیس میں لبنان کی مثال سامنے رکھیں۔ وہاں جو کچھ اقوام متحدہ نے تین سال میں کیا ہے اس کی بناء پر کوئی زیادہ توقعات نہیں رکھی جا سکتیں۔ میری نظر میں یہ بہت ہی سنجیدہ معاملہ ہے اور اس کو مؤخر نہیں ہونا چاہیے۔ واقعہ ہوئے اب تک ایک مہینہ سے زیادہ گزر چکا ہے لیکن بہت سے بنیادی سوالات کے جوابات اب بھی نہیں دیے جا رہے۔

حکمت عملی کے نقائص: آخر میں ایک بات یہ کہوں گا کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے جو حکمت عملی محترم وزیر داخلہ صاحب نے بیان فرمائی ہے، وہ بڑی عیب دار ہے۔ اس پر کھل کر بات کرنی ہوگی ہم تیار ہیں بات کرنے کے لیے۔ لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دہشت گردی کوئی نیا معاملہ نہیں ہے۔ خودکش بمبار بھی کوئی آج کی مخلوق نہیں ہیں۔ تاریخ میں سب سے پہلے خودکش حملہ آور یہودی تھے جو آج سے ۲۴۰۰ سال پہلے یونان میں سامنے آئے۔ ہماری اپنی تاریخ میں قاتلوں کا ایک پورا گروپ تھا جو تین صدیوں تک یہ تباہیاں مچاتا رہا ہے۔ جاپان، امریکہ، یورپ اور یہاں ہمارے قریب سری لنکا میں اس پر جتنا کام ہوا ہے اس میں بڑی خصوصی اہمیت سے باتیں کہی گئی ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ تمام پہلوؤں کو گہرائی میں جا کر دیکھیں۔ جہاں تک Ideology کا معاملہ ہے تو اس میں صداقت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ ۹/۱۱ کے بعد صدر بش نے جو پالیسی اختیار کی ہے اور جس میں مشرف صاحب نے ان کا ساتھ دیا ہے یہ اس کے اثرات ہیں جو ہم بھگت رہے ہیں۔ یہ خارجہ پالیسی کا مسئلہ ہے جس نے یہ ساری صورتحال پیدا کی ہے۔ آخر یہی قبائلی علاقے ہیں جہاں آج تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۰۳ء تک یہاں ایسا کوئی واقعہ کیوں نہیں ہوا، اور اب کیوں یہ واقعات ہو رہے ہیں۔ آخر آپ ان چیزوں کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کیوں نہیں کرتے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مخصوص نقطہ نظر اختیار کر کے ایک خاص انداز میں بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مشورہ کریں اور سائنسی انداز میں مطالعہ اور تجزیہ کریں۔

ایک اور بات میں یہ عرض کروں گا کہ اس ملک میں آج نہیں ایک مدت سے یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ بہت سے اقدامات کے پیچھے مخصوص ایجنسیوں یا ان ایجنسیوں کے کچھ لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ بات ہر اہم سیاسی پارٹی کے لوگوں بشمول ایم کیو ایم کے لیڈر نے کہی۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ محض یہ کہہ دینا کہ صورت حال کے ذمہ دار مدرسے اور وہاں پڑھائی جانے والی چیزیں ہیں، بہت سطحی بیان ہے۔

مدرسے تو چودہ سو سال سے قائم ہیں۔ اس عرصہ میں کبھی انہوں نے 'دہشت گرد' پیدا نہیں کیے ہیں۔ اور اگر آج پیدا ہو رہے ہیں تو یہ معاشرے کے مختلف طبقات سے بھی سامنے آرہے ہیں۔ حتٰی کہ یونیورسٹیوں اور فوجی اور دوسرے اعلیٰ فنی تعلیم والے اداروں سے بھی آئے ہیں۔ ۹/۱۱ کا واقعہ جو ہوا ہے اس کے سلسلہ میں جو اٹھارہ نام دیے جارہے ہیں ان میں کوئی ایک بھی مولوی نہیں ہے کسی مدرسے سے نہیں ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اس کو سطحی انداز میں نہ لیجیے، یہ بہت گہرا معاملہ ہے۔ چنانچہ گہرائی میں جاکر ان معاملات کا تجزیہ کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ تجزیہ کیجیے اور پھر جہاں گرفت کی ضرورت ہے گرفت کیجیے۔ جو اصل مجرم ہیں ان کو پکڑیے اور سزا دیجیے اور اگر اس میں آپ کا چہرہ بھی نظر آجائے تو اس کے لیے بھی تیار رہیے۔ (۴ فروری ۲۰۰۸ء)

مولانا فضل الرحمٰن پر خودکش حملہ

جناب والا! میں سب سے پہلے مولانا فضل الرحمٰن پر اس نہایت ہی وحشیانہ اور مذموم حملے کی پرزور مذمت کرتا ہوں جو افراد شہید ہوئے ہیں ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں اور مولانا صاحب کی جان بچنے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

دوسری بات جو سب سے اہم میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انسان تجربات سے سیکھتا ہے لیکن ہماری حکومتوں کا حال یہ ہے کہ دس سال ہونے کو ہیں اور ہم آنکھیں بند کرکے اسی غلط پالیسی کو آگے بڑھا رہے ہیں جس نے اس پورے خطے کو آگ کے شعلوں میں جھونک دیا ہے۔

جناب والا! اس پارلیمنٹ نے ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو تقریباً سوا دو سال پہلے ایک متفقہ قرارداد منظور کی اور اس کی روشنی میں اپریل ۲۰۰۹ء میں قومی سلامتی پر پارلیمانی کمیٹی نے ایک تفصیلی منصوبہ دیا جس میں قرارداد کے مطابق ۱۴ عملی نکات طے ہوئے۔ لیکن مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آج تک اس پر کوئی عمل نہیں ہوا ہے۔ درحقیقت جب تک ہم اپنا رویہ

نہیں بدلیں گے، دہشت گردی کے خلاف جنگ سے نجات کی حکمت عملی نہیں بنائیں گے اور خارجہ پالیسی کو آزادانہ بنیادوں پر استوار نہیں کریں گے اس وقت تک دہشت گردی کی لعنت سے نجات ممکن نہیں۔ اس مسئلہ کا کوئی فوجی حل نہیں بلکہ نکلنے کا راستہ صرف سیاسی راستہ ہے، وہ فوجی راستہ نہیں ہے، فوجی کارروائیاں اور دہشت گردی کے واقعات جاری ہیں اور ہر روز جانیں ضائع کر کے بڑا نقصان اٹھایا جارہا ہے۔

خدا کے لیے آنکھیں کھولیے، اس قرارداد کو نکالیے، دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھیے اور زمینی حقائق اور تاریخی تجربات کی روشنی میں مستقل حل کا راستہ اختیار کیجیے۔ (۳۰مارچ ۲۰۱۱ء)

جماعت اسلامی کے سابق ایم این اے پر حملہ

جناب والا! میں آپ کے اور اس ایوان کے توسط سے ایک نہایت اہم مسئلے کے اوپر حکومت اور قوم کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ کل باجوڑ میں جماعت اسلامی پاکستان کے صوبہ سرحد (اب خیبر پختون خوا) کے نائب امیر اور سابق ایم این اے صاحبزادہ ہارون الرشید صاحب کے گھر پر فوج کی جانب سے آپریشن کیا گیا ہے۔ گھر کو مسمار کیا گیا ہے۔ ان کی والدہ اور بھتیجی شہید ہوئی ہیں اور ان کے بھانجوں اور رشتہ داروں کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔

جناب والا! یہ صریحاً ریاستی دہشت گردی ہے۔ یہ جلتی ہوئی آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف ہے۔ جماعت اسلامی ایک جمہوری جماعت ہے اور اپنے دستور کے تحت کام کرتی ہے۔ ہم نے کبھی جمہوری طریقے سے ہٹ کر کوئی چیز اختیار نہیں کی ہے۔ ہمارا پورا ریکارڈ اس کے اوپر شاہد ہے۔ دوسری جانب صاحبزادہ صاحب باجوڑ کے ایک بہت معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی خدمات تین دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔

میری نگاہ میں، حکومت کا یہ اقدام صریحاً ظلم اور اشتعال انگیزی ہے۔ جماعت ہی نہیں، سول سوسائٹی بھی اس پر احتجاج کر رہی ہے لیکن ان شاء اللہ ہمارا احتجاج جمہوری اور پرامن ہو گا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس قسم کی اشتعال انگیزی کے جو مقامی اثرات ہیں، وہ

بڑے خطرناک ہوسکتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ نہ صرف ہم اس کی مذمت کریں بلکہ جو لوگ ذمہ دار ہیں ان کا احتساب ہو اور عوام کے سامنے ہو۔ جو پالیسیاں برطانیہ نے اختیار کیں، ہم اندھے ہو کر محض حکومت کی طاقت کے نشے میں ان چیزوں کو اختیار نہ کریں۔

مکانوں کو مسمار کرنا بذات خود غلط عمل ہے، پھر وہاں پر جو لوگ موجود ہیں، ان کو متنبہ کیا جاتا ہے اور جگہ کو خالی کرا کر آپریشن صرف مطلوبہ افراد کے خلاف کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک نہیں، میرے علم کی حد تک تین گھر اس آپریشن سے تباہ ہوئے ہیں اور ۷۵ سالہ بزرگ خاتون، ان کی والدہ اور بھتیجی شہید ہوئی ہیں۔ وہاں کون سی القاعدہ بیٹھی ہوئی تھی؟ کیا ان کو معلوم نہیں ہے کہ القاعدہ سے جماعت اسلامی اور اس کے افراد کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور نہ ہو سکتا ہے۔ ہم اس طریق کار کو غلط سمجھتے ہیں جو ان کی جانب سے استعمال کیا گیا ہے لیکن دہشت گردی کے نام پر جو کچھ یہ حکومت، امریکہ اور ہماری فوج کر رہی ہے، وہ قانون، دستور، بین الاقوامی ضابطوں، جنیوا کنونشن، ہر ایک کی خلاف ورزی ہے اور یہ چیزیں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ آپ کے توسط سے میں بھرپور احتجاج کرتا ہوں۔

(۱۶ فروری ۲۰۱۰ء)

سانحۂ راولپنڈی: فرقہ واریت کی جنگ کی طرف دھکیلنے کی کوشش

۱۰ محرم الحرام کو راولپنڈی میں جو المناک اور خوں آشام واقعہ رُونما ہوا ہے، اس پر ہر آنکھ اشک بار اور ہر زبان مصروفِ مذمت ہے۔ مسجد، مدرسہ، امام بارگاہ، سب کا تقدس بے دردی اور بے شرمی سے پامال کیا گیا۔ کم از کم ۱۱ افراد شہید ہوئے اور ۱۰۰ کے قریب زخمی، جب کہ ۲۰۰ دکانیں نذرِ آتش کی گئیں۔ قیمتی جانی اور مالی نقصان کا ابھی پورا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ توقع ہے کہ جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا ہے وہ پورے حالات کا بے لاگ جائزہ لے کر تمام صورتِ حال قوم کے سامنے لائے گا۔ تاہم، یہ ایک حقیقت ہے کہ اس واقعے نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ پوری قوم مغموم اور مشتعل ہے۔ بڑے بنیادی سوالات ہیں جو ہر ذہن کو پریشان کر رہے ہیں اور ان کے واضح جواب تلاش کرنا اربابِ حکومت کی ذمہ داری ہے تاکہ قوم کے سامنے تمام حقائق آسکیں اور اس خونیں واقعے کے تمام ذمہ داران کو قرار واقعی اور عبرت ناک سزا مل سکے۔

بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ واقعہ محض اتفاقی نہیں اور قوم کو فرقہ واریت کی جنگ کی طرف دھکیلنے کے کسی منصوبے کا پیش خیمہ ہے، اور حکومت کی بے تدبیری، نااہلی اور پوری انتظامی مشینری کی غفلت یا کچھ سرکاری عناصر کی معاونت سے اتنا بڑا واقعہ رُونما ہوا ہے۔ پانچ گھنٹے تک معصوم انسان مرتے رہے۔ عبادت گاہیں، مدرسے اور دکانیں جلتی رہیں اور پوری سرکاری مشینری غیر حاضر یا غیر مؤثر تھی اور بالآخر شہر میں کرفیو لگانا پڑا اور فوج کو انتظام سپرد کرنا پڑا۔ جو عناصر اس تباہی کے ذمہ دار ہیں ان کو پوری دیانت اور سُرعت سے حقیقی آہنی

ہاتھوں سے قانون کے مطابق گرفت میں لانے کی ضرورت ہے۔ روایتی تحقیقات اور لیپاپوتی نے حالات کو بگاڑ کی اس انتہا پر پہنچا دیا ہے جہاں آج ہم ہیں۔ اس مجرمانہ روش کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

مسئلے کے تین پہلو ہیں جن کی طرف ہم توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں:

پہلا بنیادی مسئلہ، پورے معاملے کی بے لاگ تحقیق اور پوری شفافیت کے ساتھ اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کم سے کم مدت میں اس تحقیق کی روشنی میں مؤثر کارروائی۔ شر پسند عناصر اور ان کے پشتی بانوں کو گرفت میں لانا اور مؤثر اور فی الفور عدالتی کارروائی کے ذریعے انھیں ان کے گھناؤنے جرائم کی پوری پوری سزا۔ اس سلسلے میں شر پسند عناصر کے ساتھ پولیس، انتظامیہ اور خفیہ اداروں کی کارکردگی پر بھی مؤثر گرفت ہونی چاہیے اور جس کی جتنی ذمہ داری ہے اس کے مطابق اسے سزا ملنی چاہیے تاکہ انصاف ہو اور انصاف ہوتا نظر آئے، اور مجرموں کو کھلے عام سزا ملے تاکہ وہ نشانِ عبرت بنیں اور آیندہ کے لیے ایسے واقعات سے ملک کو محفوظ کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ جو افراد متاثر ہوئے ہیں ان کی فوری امداد.... شہدا کے خاندانوں اور زخمیوں کی مدد، اور جن کی دکانیں جل گئی ہیں اور عمر بھر کی پونجی سے وہ محروم ہوگئے ہیں ان کی معاشی بحالی کا فوری انتظام، نیز مسجد، مدرسہ اور دکانوں کی فوری تعمیرِ نو، تاکہ متاثرہ افراد اور اداروں کی تلافی ہوسکے۔ یہ تمام کام پوری مستعدی سے اور کم سے کم وقت میں انجام پانے چاہییں، اور راولپنڈی کی دینی اور سیاسی قیادت کو اس پورے عمل کی نگرانی کرنی چاہیے۔

دوسرا بنیادی مسئلہ وہ فرقہ وارانہ کشیدگی ہے جو اس واقعے کے نتیجے میں رُونما ہوئی ہے۔ اِکّادُکّا واقعات پہلے بھی رُونما ہوتے رہے ہیں۔ چند گروہ مختلف شکلوں میں اور مختلف مقامات پر یہ کھیل کھیلتے رہے ہیں اور حکومت نے ان عناصر کو قابو کرکے اور قانون کی گرفت میں لانے کے بارے میں مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ الحمدللہ بحیثیت مجموعی پاکستانی معاشرے میں اہلِ سنت اور اہلِ تشیع شانہ بشانہ زندگی گزار رہے ہیں اور شر پسند

عناصر ان کے درمیان منافرت کے فروغ اور تصادم کے کھیل میں کامیاب نہیں ہوسکے، لیکن اس واقعے نے نئے خطرات کو جنم دیا ہے اور پورے ملک میں جذبات میں بے حد اضطراب بلکہ اشتعال ہے۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مسئلے کو پوری سنجیدگی سے لیا جائے اور اس چنگاری کو بجھانے کے لیے کوشش کی جائے تاکہ یہ کسی بڑی آگ کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں بھی ایسے حالات پیدا ہوئے تھے مگر ملک کی تمام ہی دینی جماعتوں نے بڑی حکمت اور بالغ نظری کے ساتھ حالات پر قابو پایا، ملّی یک جہتی کونسل کی شکل میں ایک منظم تحریکی قوت بن کر تمام مکاتیب فکر کو ایک دوسرے سے قریب لایا گیا، ایک دوسرے کی بات کو کھلے دل سے سنا گیا اور حقیقی شکایات کا ازالہ کیا گیا، اور ملی یک جہتی، رفاقت باہمی اور رواداری کی راہیں استوار کی گئیں۔ آج اس کی ضرورت ماضی سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ جس طرح اس وقت فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے اور غلط فہمیوں اور دُوریوں کو پیدا کرنے والے عوامل کی نشان دہی کرنے کے ساتھ متفقہ طور پر ایک ضابطۂ اخلاق طے کیا گیا آج اس کے احیا اور اس پر سختی سے عمل کی ضرورت ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں اور ملک کے تمام دینی اور سیاسی عناصر اس سلسلے میں اپنا کردار پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیں۔ ملّی یک جہتی کونسل کو بھی اس سلسلے میں از سرِنو پہل کرنا چاہیے۔ اسی طرح مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ان اصولوں کی روشنی میں فی الفور ضروری قانون سازی کا اہتمام کرنا چاہیے، نیز مسجد و محراب، اسکول اور مدرسہ، اور میڈیا سے ان اصولوں کی بار بار تلقین کی جائے اور عملاً ان کے احترام کا اہتمام کیا جائے۔

ملّی یکجہتی کونسل کا طے کردہ ضابطۂ اخلاق

۱۔ اختلافات اور بگاڑ کو دُور کرنے کے لیے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ تمام مکاتیب فکر نظم مملکت اور نفاذِ شریعت کے لیے ایک بنیاد پر متفق ہوں۔ چنانچہ اس مقصد کے

لیے ہم ۳۱ سرکردہ علما کے ۲۲ نکات کو بنیاد بنانے پر متفق ہیں۔

۲۔ ہم ملک میں مذہب کے نام پر دہشت گردی اور قتل و غارت گری کو اسلام کے خلاف سمجھنے، اس کی پُرزور مذمت کرنے اور اس سے اظہارِ براءت کرنے پر متفق ہیں۔

۳۔ کسی بھی اسلامی فرقے کو کافر اور اس کے افراد کو واجب القتل قرار دینا غیر اسلامی اور قابلِ نفرت فعل ہے۔

۴۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و حُرمت ہمارے ایمان کی بنیاد ہے اور آنحضورؐ کی کسی طرح کی توہین کے مرتکب فرد کے شرعاً و قانوناً موت کی سزا کا مستحق ہونے پر ہم متفق ہیں۔ اس لیے توہین رسالتؐ کے ملکی قانون میں ہم اس میں ہر ترمیم کو مسترد کریں گے اور متفق اور متحد ہو کر اس کی مخالفت کریں گے۔ عظمت اہلِ بیت اطہار و امام مہدی رضی اللہ عنہم، عظمت ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہ اور عظمت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین و خلفاے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ایمان کا جز ہے۔ ان کی تکفیر کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور ان کی توہین و تنقیص حرام اور قابلِ مذمت و تعزیری جرم ہے۔

۵۔ ایسی ہر تقریر و تحریر سے گریز و اجتناب کیا جائے گا جو کسی بھی مکتبۂ فکر کی دل آزاری اور اشتعال کا باعث بن سکتی ہے۔

۶۔ شر انگیز اور دل آزار کتابوں، پمفلٹوں اور تحریروں کی اشاعت، تقسیم و ترسیل نہیں کی جائے گی۔

۷۔ اشتعال انگیز اور نفرت انگیز مواد پر مبنی کیسٹوں پر مکمل پابندی ہوگی اور ایسی کیسٹیں چلانے والا قابلِ سزا ہوگا۔

۸۔ دل آزار، نفرت آمیز اور اشتعال انگیز نعروں سے مکمل احتراز کیا جائے گا۔

۹۔ دیواروں، بسوں اور دیگر مقامات پر دل آزار نعرے اور عبارتیں لکھنے پر مکمل پابندی ہو گی۔

۱۰۔ تمام مسالک کے اکابرین کا احترام کیا جائے گا۔

۱۱۔ تمام مکاتیب فکر کے مقاماتِ مقدسہ اور عبادت گاہوں کے احترام و تحفظ کو یقینی بنایا جائے گا۔

۱۲۔ جلسوں، جلوسوں، مساجد اور عبادت گاہوں میں اسلحہ خصوصاً غیر قانونی اسلحے کی نمائش نہیں ہو گی۔

۱۳۔ عوامی اجتماعات اور جمعہ کے خطبات میں ایسی تقریریں کی جائیں گی جن سے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں مدد ملے۔

۱۴۔ عوامی سطح پر ایسے اجتماعات منعقد کیے جائیں جن سے تمام مکاتیب فکر کے علماء بیک وقت خطاب کر کے ملّی یک جہتی کا عملی مظاہرہ کریں۔

۱۵۔ مختلف مکاتیب فکر کے متفقات اور مشترکہ عقائد کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

۱۶۔ باہمی تنازعات کو افہام و تفہیم اور تحمل و رواداری کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔

۱۷۔ ضابطۂ اخلاق کے عملی نفاذ کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ تشکیل دیا جائے گا جو اس ضابطے کی خلاف ورزی کی شکایات کا جائزہ لے کر اپنا فیصلہ صادر کرے گا، اور خلاف ورزی کے مرتکب کے خلاف کارروائی کی سفارش کرے گا۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم ایک تیسری بات بھی کہنا چاہتے ہیں اور پوری ذمہ داری اور بے باکی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک مدت سے مغربی اقوام اور خصوصیت سے امریکہ کے پالیسی ساز اداروں اور خود امریکی حکومت کی یہ پالیسی رہی ہے کہ مسلم دنیا کو

تقسیم در تقسیم کا نشانہ بنایا جائے، اور اس میں نسلی اور زبانی عصبیتوں کے ساتھ مذہبی، مسلکی اور فرقہ وارانہ عصبیتوں کو اُبھارا جائے اور ان کی بنیاد پر مسلم ممالک کو تقسیم کیا جائے۔

اس سلسلے کا آغاز مغربی استعمار کے مسلم دنیا پر غلبے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور دولتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ان ہی عصبیتوں کو اُبھارا گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہنری کسنجر نے عرب دنیا کو امریکہ کے قابو میں رکھنے اور اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنے کے مذموم مقاصد کو یقینی بنانے کے لیے جو حکمت عملی تجویز کی تھی، اس میں نسلی اور مذہبی عصبیت کی بنیادوں پر عرب ممالک کے سیاسی نقشے کی از سرِ نو تشکیل کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ متعدد امریکی تھنک ٹینک (Think Tank) انھی خطوط پر پالیسی سازی کے مشورے دیتے رہے ہیں اور نئے سیاسی نقشے بنانے میں مصروف ہیں۔

رابن رائٹ (Robin Wright) نے نیویارک ٹائمز میں ۲۸ ستمبر ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں مشرقِ وسطیٰ کا ایک نیا نقشہ تجویز کیا ہے جو نئی سُنّی اور شیعہ ریاستوں سے عبارت ہو گا اور آج کے پانچ ممالک ۱۴ ملک بن جائیں گے۔ عراق اس کی پہلی بڑی تجربہ گاہ بنائی گئی تھی اور شام، بحرین اور افغانستان کو اس آگ میں دھکیلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور پاکستان بھی اس مذموم ایجنڈے کا حصہ ہے۔ مقصد یہ کہ جہاں بھی کسی ملک کو فوری طور پر تقسیم کیا جاسکتا ہو، وہاں اس کے لیے فضا ساز گار کی جائے اور جہاں فرقہ وارانہ اور مسلکی ریاستیں نہ بھی بن سکتی ہوں وہاں بھی فرقہ اور مسلک کی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کا کھیل کھیلا جائے، اور اس میں امریکہ ہی نہیں چند مسلمان ممالک کے کچھ حکمران بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ عراق میں امریکہ نے یہ سارا کھیل کس طرح کھیلا ہے، اس کی پوری تصویر ایک تجزیہ نگار ایشلے اسمتھ (Ashley Smith) نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں پیش کی ہے جو کاؤنٹر پنچ کے ۱۱ نومبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس سے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں تاکہ سامراجی قوتوں کے اصل کھیل کو سمجھا جاسکے اور ان لبرل دانش وروں کا اصل چہرہ بھی دیکھا جاسکے جو اس خطرناک کھیل میں آلۂ کار بن رہے ہیں۔

بلاشبہ بیرونی قوتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنا کھیل کھیل رہی ہیں لیکن ان کو اعوان و انصار ہمارے اپنے درمیان سے مل رہے ہیں، اور ہماری فکری اور سیاسی قیادت اپنی لاعلمی یا مفادات کی پرستش میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے مقاصد کے آگے بڑھانے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم ان بیرونی سازشوں کو بھی سمجھے لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے گھر کی حفاظت اور اپنی صفوں کو ایسے عناصر سے پاک کرنے کی فکر کرے جو اس خطرناک کھیل کا حصہ بن رہے ہیں۔

ایشلے اسمتھ صاف لفظوں میں کہتا ہے: عراق اور خطے میں فرقہ واریت پھیلنے کے پیچھے اصل مجرم امریکہ ہے۔ بش انتظامیہ سُنّیوں اور شیعوں دونوں کی اس مزاحمت کے خلاف جنگ کی مرتکب ہوئی جو وہ بیرونی استعمار کے خلاف کر رہے تھے۔ امریکی افواج نے پہلے سُنّی مزاحمت کو بہت زیادہ ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا اور گھروں پر حملے، عام آدمیوں کی پکڑ دھکڑ، ابوغریب میں قیدیوں پر تشدد، اور پورے پورے شہروں، جیسے فلوجہ میں تباہی پھیلانے کو ہدف بنایا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ نے شیعہ رہنما مقتدا الصدر اور اس کی مہدی فوج کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایک مختصر عرصے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی سُنّی اور شیعہ مزاحمت جو متحد ہونے والی ہے، اس کو روکنے کے لیے واشنگٹن نے سامراج کی پٹاری کا پرانا نسخہ: 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کو استعمال کیا۔ اس طرح امریکہ نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے فرقہ واریت کو بڑھایا جس کے ذریعے عراق میں جاری تشدد کا بیج ڈالا گیا۔ ایشلے اسمتھ نے اپنے مضمون میں صدر بش کے دور میں رُوبہ عمل لائی جانے والی حکمت عملی کا قدم بہ قدم ذکر کیا ہے اور پوری تفصیل سے امریکی اقتدار کے چھے سال کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ کس طرح عراق میں شیعہ سُنّی تصادم کی آگ کو بھڑکایا گیا، اور اب عراق شیعہ، سُنّی اور کرد تین حصوں میں عملاً بٹ چکا ہے۔

اپنے اس تجزیے کی تائید میں ایشلے اسمتھ نے ایک اور مصنف نیر روزن (Nir Rosen) کی کتاب Aftermath: Following the Bloodshed of

America's Wars in the Muslim World کا حوالہ دیا ہے جس کا ایک اقتباس چشم کشا ہے:

> گو شیعہ اور سُنّیوں کے درمیان کبھی بھی مکمل ہم آہنگی نہیں رہی، لیکن ان کے درمیان عراق پر امریکی حملے کے وقت تک خانہ جنگی کی تاریخ بھی نہیں تھی۔ آج اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر فروغ دینے والی فرقہ واریت، ذرائع ابلاغ میں مباحث کی بھرمار اور سیاست دانوں اور علما کے جو مباحثے نظر آرہے ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی، لیکن عراق پر قبضے کے بعد جو علاقے امریکہ کے قبضے میں تھے ان میں سُنّیوں اور شیعوں کے درمیان خونیں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہاں تک کہ شیعہ اور سُنّی تعلقات اس سطح تک پہنچ گئے کہ اگر آپ کسی اجنبی سے ملیں تو پہلی بات یہ جاننا چاہیں گے کہ وہ شیعہ ہے یا سُنّی۔

اسی طرح خود رینڈ کارپوریشن جو امریکہ کا ایک بہت ہی معروف اور بااثر تحقیقی ادارہ ہے، اس کی ایک اہم رپورٹ The Muslim World After 9/11 جو صدر جارج بش کے دوسرے دور میں شائع ہوئی تھی اور جو باقاعدہ امریکہ کی ایئر فورس کی دعوت پر تیار کی گئی تھی اور اس واضح مقصد کے لیے تیار کی گئی تھی کہ مسلم دنیا میں وہ کون کون سے کمزور پہلو ہیں جن کا فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ تحقیق کروانے والوں کے اپنے الفاظ میں: فرقہ، نسل، علاقہ اور قوم کی بنیاد پر جو تفریق موجود ہے اس کی تشخیص کرنا اور یہ اندازہ کرنا کہ اس تفریق سے امریکہ کے لیے کس طرح کے چیلنج اور مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ رینڈ کارپوریشن نے اس تحقیقی رپورٹ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ: ''شیعہ سُنّی اور عرب اور غیر عرب کے اختلاف کو مسلم دنیا میں امریکہ کے پالیسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے''۔ اس رپورٹ میں اس توقع کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ نئے حالات میں خود سعودی عرب کی شیعہ آبادی امریکہ کی طرف اپنے جھکاؤ کا مظاہرہ کرے گی: ان کی اُمید یہ ہے کہ عراق میں جمہوریت کے ذریعے شیعہ اکثریت کو اس ملک میں سیاست میں زیادہ مقام ملے گا اور سعودی

عرب میں اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو گا۔ اس طرح کی اُمیدیں امریکہ کے لیے یہ مواقع پیدا کرتی ہیں کہ وہ اپنی پالیسی کو شیعہ جذبات سے ہم آہنگ کرے تاکہ جن ملکوں میں دوسرے لوگ حکمران ہیں وہاں انھیں زیادہ سے زیادہ مذہبی اور سیاسی اظہار کی آزادی ملے اور اپنے معاملات میں ان کی رائے کا وزن بڑھے۔ یہ ہے وہ نقشۂ جنگ جو ہمارے دشمنوں نے ترتیب دیا ہے اور ہم ہیں کہ اس جنگ میں شریک ہو کر اپنے ہی دشمنوں کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے جرم میں شریک ہو رہے ہیں۔

مسلمانوں کے تمام ہی معروف فرقے اور مسالک صدیوں سے ایک اُمت کے حصے کے طور پر اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کو اپنا رب ماننے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی اور آقا، اور سند تسلیم کرنے کے بعد ہم سب ایک رشتے میں جڑ گئے ہیں اور اختلافات جو بھی ہیں، وہ اپنی اپنی دلیل پر مبنی ہیں جن کا ماخذ اور سند بالعموم قرآن و سنت ہی ہیں، اور ہر ایک کا مقصد اور خواہش اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت ہی ہے:

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱:۹۲-۹۳)

یہ تمھاری اُمت حقیقت میں ایک ہی اُمت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، پس تم میری عبادت کرو۔ مگر (یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ) انھوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا..... سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳)

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اُس احسان کو

یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اُس نے تمھارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمھارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمھیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی رسی، یعنی دین اور شریعت کو مضبوطی سے تھامنا ہی دنیا میں راہِ ثواب کے حصول اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہے اور اُمت کی وحدت کتاب و سنت پر قائم رہنے پر منحصر ہے۔ پھر تفرقہ اور آپس میں پھوٹ ڈالنے سے واضح طور پر منع فرمایا ہے کہ یہ اُمت کو پارہ پارہ کرنے کا راستہ ہے۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اختلاف سے منع نہیں کیا، تفرقے سے روکا ہے اور دونوں میں جوہری فرق ہی یہ ہے کہ اختلاف، اخلاص اور دیانت سے، دلیل کی بنیاد پر، تلاشِ حق کے جذبے ہی کی خاطر ایک فطری عمل ہے جس کی روایت دور رسالت مآبؐ اور صحابہؓ سے آج تک اُمت کی روشن شاہراہ کا حصہ رہی ہے۔ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: اِخْتِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ "میری اُمت کے درمیان اختلاف رائے ایک رحمت ہے"۔

مفتی محمد رفیع عثمانی 'اختلاف' اور 'تفرق' کا فرق یوں واضح فرماتے ہیں کہ "اختلاف کا حاصل اور لبِ لباب تین چیزیں ہیں: ایک یہ کہ جو اختلاف قرآن و سنت کی بنیاد پر اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ ہو، اور اختلاف کرنے والوں میں وہ اہلیت بھی موجود ہو جو اس کے لیے ضروری ہے، تو یہ اختلاف ممنوع نہیں بلکہ اُمت کے لیے رحمت ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ اختلاف ایسے مسائل میں ہو جن میں قرآن و سنت نے کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں کیا، اور ایسے مسائل میں جن میں اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے، یعنی ایک سے زیادہ آرا کا احتمال ہوتا ہے۔ ان میں جو فریق بھی جو رائے دلائل کی بنیاد پر قائم کرلے وہ ناجائز اور ناپسندیدہ نہیں ہوتی۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہم جو، مثلاً یہ کہتے ہیں کہ ہم حنفی ہیں اور فلاں شافعی یا مالکی یا حنبلی ہے، تو اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہوتا کہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہی یقینا، یقیناً صحیح ہے، اور امام شافعیؒ کا قول یا کسی اور امام، مثلاً امام احمد بن حنبلؒ یا امام مالکؒ کا قول جو اس کے مقابلے میں ہے، وہ یقیناً غلط ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارا قول مَظْنُوْنُ الصَّوَابْ اور مُحْتَمَلُ الْخَطَاءِ ہے، جب کہ دوسروں کا قول مَظْنُوْنُ الْخَطَاءِ اور مُحْتَمَلُ الصَّوَابِ ہے، یعنی ظنِ غالب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا قول صحیح ہے، اگرچہ احتمال اس کے غلط ہونے کا بھی ہے۔ دیگر ائمہ کے بارے میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہمارا ظن غالب یہ ہے کہ وہ خطا ہے لیکن احتمال یہ بھی ہے کہ وہ صحیح ہو۔

دوسری چیز ہے 'تفرق'، یعنی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا۔ یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ شریعت نے کسی بھی حالت میں اس کی اجازت نہیں دی۔ خنزیر کا گوشت کھانا جتنا بڑا حرام ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اس سے بڑا حرام ہے۔ خالص انگور کی شراب پینا جتنا بڑا گناہ ہے، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اس سے بڑا گناہ ہے.... لیکن مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی اجازت کسی حالت میں نہیں دی۔ جتنا ہم نے قرآن و سنت میں غور کیا اور جتنا ہمارے بزرگوں نے ہمیں سکھایا، ہمیں یہی نظر آیا کہ 'تفرق' اور فرقہ بندی کے جواز کی کوئی صورت نہیں"۔

اور پھر رواداری اور رحماء بینھم بننے کا نسخہ بھی یوں بیان کرتے ہیں: "اس سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانوی کا ملفوظ جو بہت مختصر ہے، یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ "اپنا مسلک چھوڑو نہیں، دوسروں کا مسلک چھیڑو نہیں"۔ جو جس مسلک کا پیروکار ہے وہ اپنے مسلک پر عمل کرے، لیکن دوسروں کو نہ چھیڑے۔ پس میری گزارشات کا خلاصہ یہ نکلا کہ اختلاف رائے جائز ہے اور اختلاف کرنے والوں کی آرا کا احترام لازم ہے لیکن افتراق کسی حال میں جائز نہیں۔ ہم اسی افتراق کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔ آج کفر ہمیں مٹانے پر تلا ہوا ہے، اور ہم آپس میں جھگڑے کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مسلک پر عمل کرے اور بھائیوں کی طرح مل کر رہیں اور مل کر کفر کا مقابلہ کریں"۔

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی حالت اور وقت کی ضرورت دونوں کو کس خوبی سے پیش کیا ہے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

(عالمی ترجمان القرآن دسمبر ۲۰۱۳ء)

بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں
دہشت گردی اور قوت کا استعمال

جناب چیئرمین! میں آپ اور آپ کے ساتھ ہی لیڈر آف دی ہاؤس کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپوزیشن کی طرف سے بلوچستان کے موضوع پر اس اجلاس کے سلسلے میں اسی رواداری اور تعاون کا مظاہرہ کیا جس کی ہمیں ان سے توقع تھی۔ ہم لوگ یقین دلاتے ہیں کہ اپوزیشن اس مسئلے کو صرف اور صرف ملک اور قوم کے مفاد میں نمایاں کر رہی ہے۔ میں ذاتی طور پر کوئی کریڈٹ بھی نہیں لینا چاہتا لیکن جیسے ہی میں رات کو واپس آیا ہوں تو میں نے رضا ربانی صاحب کو خود ٹیلی فون کیا اور یہ کہا کہ بلوچستان کا مسئلہ جس رخ پر جا رہا ہے ہمارا فرض ہے کہ فوری طور پر سینیٹ کا اجلاس بلائیں اور اس پر توجہ مرکوز کریں۔ میں اپنے بلوچستان کے بھائیوں اور ساتھیوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کا مسئلہ صرف ان کا مسئلہ نہیں وہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ وہ پورے پاکستان کا مسئلہ ہے اور ان شاء اللہ ہمیں، پاکستان اور اس ملک کے تمام شہریوں کے بہترین مفاد میں اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ جناب والا! میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں گفتگو کے دوران بار بار شناخت کی بات کی گئی ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ یہ بات آپ سے عرض کروں کہ شناخت کا معاملہ ایک بڑا بنیادی اور نازک معاملہ ہے۔

شناخت کی حقیقت: ہر انسان کے شناخت کے مختلف خاکے ہوتے ہیں۔ یعنی ایک شناخت یہ ہے کہ میں ایک خاندان کا فرد ہوں۔ شوہر اور بیوی، بچے، گھر کے بزرگ یہ سب ہماری شناخت کا اہم حصہ ہیں۔ پھر شناخت بڑھ کر کے قبیلہ، برادری اور گروہ بناتی ہے۔ اس سے آگے شناخت کا دائرہ قوم، ملک، پوری اسلامی امّہ اور پوری انسانیت تک وسیع ہوتا ہے۔ ان

میں ہر ایک شناخت کی ایک حیثیت ہے اور اگر اسے حقیقت پر مبنی مقام پر پرکھا جائے تو اس میں سے ہر ہر شناخت کا تحفظ اور اس کا اعتراف، اس کی ترقی، یہ ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑی خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرٰت ۴۹:۱۳)

لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

یوں شناخت کا معاملہ بڑا اہم ہے۔ دوسری جانب اس میں ہمارے بلوچ، پشتون، پنجابی اور سندھی بھائی اپنی اپنی شناخت کے ساتھ باہم مل کر ایک گلدستے کی طرح ایک باغ کا حصہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنے مقام پر رہنا، ضروری ہے لیکن ساتھ ساتھ ہم سب پاکستانی اور مسلمان ہیں۔ ہمیں ان تمام شناختوں کو ملا کر کے ایک دوسرے سے متصادم نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنانا ہے۔

قوت کے بجائے افہام و تفہیم پر زور: جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو قابل قبول نہیں ہے۔ سیاسی معاملات کو گولی سے حل کرنے کی کوشش، خواہ وہ فرد کرے یا کوئی گروہ اور یا حکومت اور اقتدار کرے، یا کسی اور سطح پر ہو یہ سب قابل مذمت ہیں۔ یہ تمام غلط ہیں اور جمہوریت اور انسانیت کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس تناظر میں ہم ہر قسم کی دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں اور اسے ملک کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ معاملات کا حل ہمیشہ سیاسی انداز میں اور افہام و تفہیم سے ہو گا، بول چال اور کچھ لو، کچھ دو سے ہو گا اور ایک دوسرے کے حقوق اور احترام سے ہو گا۔

بے چینی کے اسباب پر توجہ دیجیے: ان دو بنیادی باتوں کے بعد جناب والا! میں جن چیزوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ بلاشبہ بلوچستان کے علاوہ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی بے اطمینانی موجود ہے۔ لیکن اس وقت بلوچستان کا مسئلہ ایک گھمبیر مسئلہ اختیار کر چکا ہے، اس کو پردے کے پیچھے ڈالنا اور یا نظر انداز کرنا بڑا نقصان دہ ہو گا۔ یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ آخر بلوچستان کے ہمارے بھائی اس وقت کیوں اس شدت سے بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ثناء اللہ بلوچ نے ابھی تقریر کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے چند الفاظ سے کسی کو اختلاف ہو لیکن بحیثیت مجموعی ان کی گفتگو بہت مدلل، دردمندانہ، ملک کے مفاد میں اور دستور کے تحفظ کے لیے ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم سیاسی جانب داری سے کام لیں، ہمیں کھلے دل سے صورت حال پر غور کرنا چاہیے۔

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ گوادر پورٹ کی ترقی کا مسئلہ آج پیدا نہیں ہوا ہے۔ خود بلوچ اس کے بارے میں مدت سے پکار رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اس علاقے کو ترقی دو۔ بلوچستان میں تزویراتی ریلوے کا تصور انگریز نے دیا تھا۔ قومی شاہراہ کی متبادل لائن کی تعمیر پر آج نہیں بلکہ پچاس سال سے ہم اس کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب وہ ماضی میں ان چیزوں کا مطالبہ کر رہے تھے تو آج ان کے بارے میں پریشان کیوں ہیں؟ میری نگاہ میں اس کی بنیادی وجہ ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم نے ان تمام معاملات کو دستور کے تحت مشاورت اور علاقے کے لوگوں کی شرکت اور اعتماد کے بغیر کیا ہے۔ اس طرح کیا ہے کہ اس سے بدگمانیوں نے جنم لیا ہے اور ان بدگمانیوں کے لیے وجوہ موجود ہیں۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ بے اطمینانی کے اسباب کو جاننے کی کوشش کیجیے اور اگر کہیں تشدد کے کچھ ناقابل قبول واقعات ہو رہے ہیں تو اس کا توڑ طاقت کا استعمال نہیں ہے بلکہ بے اطمینانی کے اسباب کو سمجھنا اور مشاورت سے حل نکالنا ہے۔

حقائق چھپانا مسئلہ کا حل نہیں: دوسری بنیادی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں جس کی جانب میرے

بھائی جنرل جاوید اشرف قاضی نے بھی اشارہ کیا ہے کہ حقائق صحیح پیش ہونے چاہییں۔ ابھی سینیٹ کا ایک وفد گوادر پورٹ کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ وہاں کی اتھارٹی کے ذمہ دار افراد نے یہ بات کہی کہ یہاں پر ماہی گیری کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور کوئی بے گھر نہیں ہوا۔ جناب والا! ایک ایسے مقام پر جہاں مچھیروں کی ایک پوری بستی قدیم زمانے سے آباد ہو اور وہ اب وہاں سے ختم کی جارہی ہو اور وہاں کے مکین اپنے مطالبات میں روزگار کی بات کر رہے ہوں، آپ کی بات پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں۔ مجھے بتایئے کہ اس سے زیادہ دیدہ دلیری اور کیا ہوسکتی ہے! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ براہ مہربانی حقائق کو چھپانے یا نظر انداز کرنے کی کوشش نہ کیجیے، حقائق کا سامنا کیجیے اور ان کا حل نکالیے۔

مقامی وسائل اور مقامی لوگوں کے حقوق: اس کے ساتھ ہی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کے لوگوں کا وہاں کے وسائل پر حق ہے۔ اسی طرح سرحد، پنجاب اور سندھ کے باشندوں کا اپنے علاقے کے وسائل پر حق ہے اور پوری پاکستانی قوم کا حق پاکستان کے وسائل پر ہے۔ یہ سارا کام ہمیں افہام و تفہیم سے اور ایک دوسرے کے حقوق کو پوری طرح ادا کر کے کرنا ہے۔ اگر ہم نے ان کو معاشی حقوق ادا نہ کیے، اگر وہاں شروع کیے جانے والے منصوبوں کا فائدہ ان کو نہ پہنچا، اگر بلوچستان کی گیس سے پورا ملک فائدہ اٹھا رہا ہے اور بلوچستان کے لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہے، اگر گوادر میں آپ ان کو ملازمتیں نہیں دے رہے ہیں، تعلیم فروغ نہیں پا رہی ہے، زمینوں کا حق ان کو نہیں مل رہا ہے تو یہ زیادتی ہے، اس کو قومیت کا مسئلہ نہ بنایئے۔ یہ کہنا کہ فلاں غدار اور فلاں محب وطن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان الزامات اور اصطلاحوں کو ختم کرنا چاہیے اور اصل مسائل کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

کیا کیا جائے؟

اس پس منظر میں جو مشورہ میں دینا چاہتا ہوں، اس میں سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ طاقت کا جو استعمال آپ نے شروع کیا ہے اسے فی الفور ختم کیجیے۔ گرفتاریاں، جھوٹے مقدمات،

فوجی طاقت کا استعمال، یہ اصلاح اور ملک کو سنبھالنے اور مسائل حل کرنے کا قطعاً کوئی راستہ نہیں ہے۔ وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین نے اچھا بیان دیا تھا کہ بلوچستان کے مسئلے کا حل مذاکرات ہے۔ اس لیے آیئے! ہم اس مؤقف کو لے کر ہی آگے بڑھیں۔ مذاکرات کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کی جو حقیقی قیادت ہے اور وہاں کے باعزت سردار اور منتخب نمائندے ہیں، ان کو شریک کار کریں۔ یہ آپ کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ بلوچستان کے تمام لوگوں کو کھلے دل سے مشورے کے اندر شریک کریں اور مل جل کر مذاکرات کا راستہ اختیار کیا جائے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ فوجی چھاؤنیوں کا مسئلہ ہم نے خود متنازعہ بنالیا ہے۔ بلاشبہ فوجی چھاؤنیاں ملک کی ضرورت ہیں اور اصولی طور پر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر فوج سیاست میں مداخلت کرے گی اور اپنی قوت کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرے گی تو اس کے سیاسی کردار سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ اسی طرح فوج کی تشکیل میں تمام علاقوں کے تمام افراد کو مناسب نمائندگی حاصل نہیں ہوگی تو اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر حقائق کی بنیاد پر کام کیجیے اور جو علاقہ کی دوسری ضرورتیں ہیں ان کو ترجیحی بنیاد پر پورا کیجیے۔

اگلی بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مخصوص نوعیت کے اجتماعات کرنے سے فیصلہ سازی میں لوگوں کی شرکت نہیں ہوجاتی۔ یہ محض لیپا پوتی ہے۔ شرکت ہوتی ہے فیصلہ سازی میں حقیقی مشاورت اور اس کے لیے ایک دوستانہ ماحول کی تشکیل سے۔ چنانچہ مذاکرات ہوں اور ہر ضروری معاملہ میں ہوں۔ حتٰی کہ فوجی چوکیوں کے معاملے میں بھی پوری پالیسی کو قومی مفاد اور حقیقی ضرورتوں کے مطابق زیر بحث لایا جائے۔ اور یہ عمل اس پس منظر میں ہو کہ فوج کو سیاست میں مداخلت کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ فوج صرف دفاع کے لیے ہو اور اس میں بھی پورے ملک کے تمام علاقوں کے لوگوں کو مناسب نمائندگی ملے تاکہ وہ مل کر اس کو اپنی قومی فوج کی حیثیت دے سکیں۔

معاشی وسائل کا استعمال اور معاشی وسائل پر وہاں کے لوگوں کا حق ہے۔ انہیں اپنا

حق ملنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی جو ضرورتیں ہیں ان کو بھی پورا کیا جائے۔

آخری چیز جناب والا! یہ ہے کہ ملک کی ترقی ہم سب کو عزیز ہے۔ ہم سب اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ملک کی ترقی کے نام پر کسی علاقے کے لوگوں کو وہاں کے روزگار کے مواقع سے اور ترقی کے مواقع سے محروم رکھ کر کوئی راستہ اختیار کرنا، یہ ترقی نہیں، تباہی کا راستہ ہے۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور قومی انداز میں اس مسئلے کو حل کیجیے۔ اپوزیشن آپ سے تعاون کرے گی بشرطیکہ آپ قومی مفاد میں، دستور کے تحت اور اصولوں کے مطابق معاملات کو حل کرنا چاہیں۔ اگر اس سے ہٹ کر آپ نے کوئی راستہ اختیار کیا تو وہ آپ کے لیے بھی نقصان دہ ہوگا اور ملک اور قوم کے لیے بھی اس کے نقصانات تباہ کن ہوں گے۔

(۲۰ اگست ۲۰۰۴ء)

میران شاہ میں فوجی کارروائی اور ڈرون حملے

جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بین الاقوامی قانون کے اعتبار سے اجتماعی سزا ایک جرم ہے۔ میرے پاس اس وقت ڈان اخبار کی ایک تازہ رپورٹ ہے جس کے مطابق میران شاہ کے علاقے میں غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو لگایا گیا ہے۔ میں نے اس سے پہلے بھی یہ بات کی ہے اور آج بھی کہتا ہوں کہ فوج، سرکاری نمائندے یا پولیٹکل ایجنٹس کی جانب سے وہاں جو بھی زیادتی ہو رہی ہے، وہ کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے۔ اسی طرح ہم کسی پر بھی قتل، حملے یا تخریب کاری کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم یہ بات کہیں کہ اس معاملے میں حکومت کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے کہ حکومت نے بش کے مطالبات اور امریکہ کے اس خطے میں عزائم کا آلہ کار بن کر اپنے ملک میں قتل و غارت گری اور ظلم و تشدد کی آگ بھڑکائی ہے جو جل رہی ہے اور جلتی رہے گی خدانخواستہ اگر صحیح راستہ اختیار نہ کیا گیا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ جو واقعہ ریموٹ کنٹرول سے ہوا ہے وہ جگہ میران شاہ شہر سے سات کلو میٹر دور واقعہ ہے لیکن ڈان کی خبر اور دوسری خبریں بتاتی ہیں کہ ہیلی کاپٹر

اور توپوں سے شہر، مسجد اور ہسپتال پر حملہ ہوا ہے۔ بچے اور عورتیں شہید ہوئی ہیں اور اب وہاں پر غیر معینہ کرفیو لگا دیا گیا ہے اور پورا علاقہ جل رہا ہے۔ بی بی سی کی خبر اگر آپ نے سنی ہے تو انہوں نے انٹرویوز لیے ہیں اور لوگوں نے وہاں کے جو حالات بتائے ہیں، وہ نہایت تکلیف دہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم ملک کو کہاں لے کر جا رہے ہیں؟

جناب والا! یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ خدا کے لیے حکومت آنکھیں کھولے۔ بش آپ کی طرف سے اتنا کچھ کرنے کے باوجود اور، اور کے نعرے لگا رہا ہے، کسی مقام پر بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ براہ کرم اپنی حریت، آزادی اور قومی وقار کا خیال رکھیے اور خدا کے لیے اس سلسلے کو روکیے۔ جناب! جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے مجھے خوف اور ڈر ہے کہ یہ علاقہ پاکستان کے لیے اور اس پورے علاقے کے لیے عدم استحکام کا ذریعہ بن رہا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو آپ قابو نہیں رکھ سکیں گے۔ ابھی وقت ہے، آنکھیں کھولیے اور صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کیجیے۔ (۵ جون ۲۰۰۶ء)

جناب چیئرمین! میرے پوائنٹ آف آرڈر کا تعلق امریکی ڈرونز کے اس حملے سے ہے جو کل (۲۳ اکتوبر ۲۰۰۸ء) صبح ۶ بجے میران شاہ کے علاقے میں ایک اسکول پر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں ۱۱ افراد شہید ہوئے ہیں، تین زخمی ہوئے ہیں اور اسکول تباہ ہو گیا ہے۔ میرے حساب کے مطابق پچھلے دو سالوں میں ۶۷ حملے ہوئے ہیں۔ (جبکہ پیپلز پارٹی کی) حکومت کے وجود میں آنے کے بعد یہ ۳۲ واں حملہ ہے، یعنی ان سات مہینوں میں ۳۲ مرتبہ خلاف ورزیاں ہوئی ہیں جس میں سینکڑوں افراد مارے گئے اور بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے۔

کل کے حملے کی میری نگاہ میں ایک اور اہمیت ہے کہ شب و روز کی محنت اور مشترکہ اجلاس میں سات دن گفتگو کے بعد ۱۶ رکنی کمیٹی نے ایک متفقہ قرارداد مسائل کے پرامن حل کے لیے تیار کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہم امریکہ کی دہشت گردی کی جنگ سے علیحدہ ہو سکیں اور جو ہمارے داخلی مسائل پیدا ہو گئے ہیں ان کا خوش اسلوبی سے اپنے دستور، قانون، روایات اور ان مسائل سے وابستہ تمام اداروں کی شمولیت سے حل نکالیں۔ متفقہ قرارداد کی

منظوری سے پورے ملک میں روشنی کی ایک لہر دوڑی۔

جتنا میں نے بین الاقوامی میڈیا کو کور کیا ہے، تقریباً ہر جگہ اسے غیر معمولی پیش رفت قرار دیا گیا ہے اور جس طرح وزیر اعظم صاحب نے اس پوری کی پوری اپروچ کو مشترکہ اجلاس میں منظور کروایا، وہ ایک نئی شروعات کی خبر لا رہا تھا لیکن امریکہ نے یہ عمل کر کے ہمارے اقدامات کا جواب دیا ہے کہ امریکہ اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے امکانات کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ جنوبی ایشیائی معاملات کے لیے امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ باؤچر (Richard Boucher) اجلاس کے دوران یہاں تشریف لائے اور بعینہ یہی بات کہہ کر گئے کہ ان علاقوں میں سرگرم افراد کے ساتھ مذاکرات نہیں ہونے چاہییں۔ یہ کہتے ہوئے کہ یہ راستہ نہیں ہے انہوں نے دھمکی دی کہ آپ کو کوئی پیسہ نہیں ملے گا۔ بلیک میل اور دھمکی اور اس بلیک میل کے بعد اب اس دھمکی کو عملی شکل دی جا رہی ہے کہ ابھی اس قرارداد کی روشنائی بھی تازہ تھی کہ یہ حملہ کر دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں کل کے اس واقعہ کی غیر معمولی اہمیت ہے۔

اسی بناء پر میں چاہوں گا کہ یہ ایوان بڑے واضح الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ امریکہ اور حکومت دونوں کے لیے ایک پیغام ہے، جسے میں کچھ اس طرح آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ:

> ہم امریکی ڈرون طیاروں کے ذریعے گزشتہ روز ہماری فضائی حدود کی خلاف ورزی کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ خلاف ورزی ۱۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو مشترکہ پارلیمانی قرارداد کے بعد خاص طور پر کی گئی ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ حکومت ہماری خود مختاری کی خلاف ورزیوں سے نمٹنے کے لیے مضبوط عزم کا اظہار کرے گی اور مسلح افواج کو خبردار کرے گی کہ وہ مستقبل میں اس طرح کی مداخلت اور حملوں کو روکیں۔ (۲۴۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

خیبر ایجنسی پر پاک فوج کی بمباری اور امریکی ڈرون حملے

جناب چیئرمین! میں اپنے محترم سینیٹر انجینئر ملک رشید احمد خان [قبل ازیں سینیٹر ملک رشید احمد خان نے سینیٹ کو بتایا کہ چار دن قبل وادی تیرہ [خیبر ایجنسی] میں معصوم لوگوں پر شدید بمباری ہوئی جس کے نتیجے میں ۷۵ لوگ شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ ان متاثرین کے لیے گورنر نے ایک کروڑ روپے کے پیکج کا اعلان کیا جبکہ اس سے کچھ ہی روز قبل وزیر اعلیٰ نے ایبٹ آباد کے شہداء کے لیے تین لاکھ روپے فی کس کا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے معاوضوں میں فرق کو زیادتی قرار دیا۔] اور دوسرے ساتھیوں کی بات کی تائید کرتے ہوئے یہ بات کہوں گا کہ یہ بڑا ہی سنگین مسئلہ ہے۔ واقعہ میں صرف ۷۵ افراد شہید ہی نہیں ہوئے ہیں بلکہ ڈیڑھ سو کے قریب زخمی بھی ہیں۔ جن میں سے کچھ بہت ہی خطرناک حالت میں ہیں جنہیں پشاور منتقل کیا گیا ہے۔

جناب چیئرمین! بنیادی مسئلے دو ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ اپنی قوم پر ہوائی جہازوں اور میزائل کے ذریعے سے اس طریقے سے فوج کشی کرنا اور وہ بھی ایک ایسے علاقے میں جو حکومت کا حامی اور مددگار رہا اور جہاں کسی دہشت گردی کا کوئی واقعہ کبھی رونما نہیں ہوا، کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس واقعہ کی انکوائری ہو۔ ساتھ ہی میں آپ سے یہ بھی کہوں گا کہ ہمارا میڈیا جسے آزادی کی امانت دی گئی ہے، وہ اپنا حق ادا نہیں کر رہا ہے۔ اس کو اس پورے علاقے کی کوریج کرنی چاہیے اور جس طرح وہاں شہری مارے جا رہے ہیں اور فوج کشی کے ذریعے معصوم انسان مر رہے ہیں، ان کو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

جناب والا! اگر آپ نیویارک کی Human Rights Watch رپورٹ پڑھیں تو اس میں جو حقائق دیے گئے ہیں وہ آنکھیں کھولنے والے ہیں کہ کس طرح بدقسمتی سے ہماری اپنی فوج کے ہاتھوں معصوم انسان وہاں مارے جا رہے ہیں اور اس کو محض اتفاق کہا جا رہا ہے۔ امریکہ مارتا ہے تو وہ معافی مانگ لیتا ہے۔ ہمارے ہاں وہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ

اس کی آزادانہ تحقیقات ہونی چاہیے اور یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ ان کو علاج، معاوضہ اور آگے سلامتی کی ضمانت ملنی چاہیے۔ اس کے بغیر ہمیں اطمینان نہیں ہو گا اور اگر یہ واضح ضمانت نہیں آتی تو ہم بھی ان کے اس احتجاج میں شریک ہوں گے۔

(۱۵ اپریل ۲۰۱۰ء)

جناب چیئرمین! آج صبح ایساف کی فورسز نے خیبر ایجنسی میں ایک بار پھر خود مختاری کو روندتے ہوئے حملہ کیا ہے۔ اس حملہ میں ہمارے تین فوجی شہید ہوئے ہیں۔

جناب والا! اس سے قبل ڈرون کے ذریعہ حملوں کی بارش تو مسلسل ہو رہی ہے لیکن اب یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ امریکی یا ایساف یا ان کے ہیلی کاپٹرز پاکستان کی سرزمین پر یہ حملے کر رہے ہیں اور اس طرح ہمارے شہریوں کو مار رہے ہیں۔ اس سے چار دن پہلے دو ہیلی کاپٹرز کے ذریعے ۵۰ افراد کو شہید کیا گیا اور آج یہ واقعہ ہوا ہے۔ جناب والا! یہ بے حد اہم مسئلہ ہے اور حکومت کا ردعمل میری نگاہ میں نہایت ہی کمزور ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک بنیادی فیصلہ کریں اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کی جو بھی سرحدی خلاف ورزی ہو اس کو روکنے کے لیے فوری طور پر جوابی ملٹری ایکشن کیا جائے۔ جب تک ہم اپنی آزادی اور حاکمیت کے دفاع کے لیے یہ راستہ اختیار نہیں کریں گے ہم مسلسل اسی طرح ستم کا نشانہ بنتے رہے گے۔

(۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء)

کوئٹہ میں عاشورہ کے موقع پر دہشت گردوں کا حملہ

۲مارچ ۲۰۰۴ء کو عاشورہ محرم کے روز کوئٹہ میں جلوس پر دہشت گردوں کے حملے کے نتیجے میں ہزارہ کمیونٹی کے کم از کم ۴۲ افراد ہلاک اور سو سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ عاشورہ کے ماتمی جلوس پر مین بازار میں تین دہشت گردوں نے پہلے دستی بم پھینکے پھر خود کار گنوں سے فائرنگ کی۔ اقوام متحدہ اور آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) کے سیکرٹری جنرل، نیز پاکستان کے وزیر داخلہ اور تقریباً تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں نے دہشت گردی کی اس کارروائی کی مذمت کی۔ حفاظتی فورسز کی کاروائی کے نتیجے میں دو دہشت گر دمارے گئے اور تیسرے کی حالت نازک ہے۔ پروفیسر خورشید احمد نے سینیٹ آف پاکستان میں اس واقعہ کی مذمت کرتے ہوئے ان واقعات پر انفرادی توجہ کے ساتھ ان کو وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا۔

جناب چیئرمین! سب سے پہلے تو میں وزیر اطلاعات کے بیان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ اور سنی کا کوئی جھگڑا، جس طرح اسے پیش کیا جاتا ہے، نہ اس ملک میں ہے اور نہ دنیا میں کسی اور مقام پر ہے۔ ہم ساتھ رہے ہیں، ساتھ رہیں گے، ہمارا خدا، ہمارا رسول، ہماری کتاب اور ہمارا دین ایک ہے۔ اختلافات ہر سوچنے والے گروہ میں ہوا کرتے ہیں اور یہاں بھی ہیں۔ لیکن اختلافات کے باوجود بھی لوگ ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں اس سے پہلے جب واقعات ہوئے تو ملی یکجہتی کونسل نے قوم کو جوڑنے اور ساتھ لے کر چلنے کی خدمت سرانجام دی۔ آج ہی نہیں ہمیشہ سے اس کی ضرورت ہے اور ہمیشہ اس کی ضرورت رہے گی۔

جناب والا! میں یہ صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس انکوائری کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ درحقیقت جہاں ان قیمتی جانوں کے ہلاک ہونے پر ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے وہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ متاثرین اپنے غم میں تنہا نہیں ہیں۔ سینیٹ اور پوری قوم ان کے ساتھ ہے۔ واقعہ کو کسی تحقیق کے بغیر مذہبی انتہا پسندی یا فرقہ واریت کا رنگ دینا اور اس انداز میں پیش کرنا، میری نگاہ میں صحیح نہیں ہے۔ ہمیں انکوائری کا انتظار کرنا چاہیے اور یقینی بنانا چاہیے کہ ماضی کی طرح نہ ہو کہ جتنی بھی انکوائریاں ہوئی ہیں وہ سب یا تو دریابرد ہو گئی ہیں یا بعد میں کسی نے ان کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔

جناب والا! پچھلے چھ مہینے کے اندر کوئٹہ میں اپنی نوعیت کا یہ تیسرا واقعہ ہوا ہے۔ یہ بات کہنا کہ ہماری تیاری پوری تھی اور اللہ کا شکر ہے کہ ملک میں کہیں اور ایسا نہیں ہوا، بے معنی بات ہے۔ جو کچھ معلومات سامنے آئی ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم کوئٹہ میں صحیح تیاری نہیں تھی اور نہ وہاں بروقت کارروائی کی جا سکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری انٹیلی جنس کہاں ہے اور حفاظتی فورس اس موقع پر ساتھ کیوں نہیں تھی؟ پھر جو افراتفری بعد میں مچی اور اس کے بعد جو آگ لگائی گئی، اس کو کنٹرول کرنا سول انتظامیہ کا کام تھا لیکن وہ ناکام ہو جاتی ہے اور فوج کو بلانا پڑتا ہے۔ یہ تمام چیزیں جناب والا! بڑی اہم ہیں۔

جناب والا! میں بڑے دکھ سے یہ بات کہتا ہوں کہ اتنا اندوہناک واقعہ پیش آیا ہے لیکن صدر محترم اور وزیر اعظم صاحب صرف بیان دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو فوراً وہاں موقع پر جانا چاہیے تھا۔ صرف تعزیت کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا اور قوم کو یہ پیغام دینے کے لیے کہ یہ چیز ایسی ہے جسے ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حتٰی کہ میرے علم کے مطابق کوئی مرکزی وزیر بھی وہاں نہیں پہنچا۔ یہ تفاخر کیوں ہے؟

پھر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اسی موقع پر کربلا اور بغداد میں بھی خونی واقعات ہوئے ہیں، وہ ریکارڈ پر پر ہونے چاہییں۔ میں آیت اللہ سیستانی کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے برملا یہ بات کہی ہے کہ ان ہنگاموں کا شیعہ سنی فرقہ بندی کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں ہے۔ یہ بیرونی قوتیں ہیں، امریکہ اور قابض افواج ہیں جن کی ایماء پر ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔ یہ قوتیں مسلمانوں میں انتشار اور خانہ جنگی پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ اس تناظر میں ہم اور عراق سب ایک ہی مسئلے سے دوچار ہیں اور اسی تناظر میں ہمیں اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ از سر نو غور کرنا چاہیے کہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟

جناب والا! میں اس واقعے کی مذمت کرتا ہوں جس کی حکومت بھی ذمہ دار ہے۔ لیکن اس کے پس منظر میں محض مذہبی انتہا پسندی کا نام نہ لیں بلکہ جو ادارے بھی اس میں ملوث ہیں ان کا نام بھی سامنے آنا چاہیے۔ دوسری جو قوتیں بھی اس میں ملوث ہیں، ان کو سامنے رکھنا از حد ضروری ہے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ شہداء کے لیے دعائے مغفرت بھی کرنی چاہیے۔ جو خاندان اپنے پیاروں سے محروم ہوئے ہیں ان کے ساتھ ہمدردی کے علاوہ جو کچھ کیا جا سکتا ہے اس کا اہتمام کیا جائے۔ محض ایک لاکھ روپیہ دے دینا کافی نہیں ہے۔ اس ملک میں امت کی وحدت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ غم میں سب کو شریک ہونا چاہیے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انٹیلی جنس کی ناکامی، ان کا بروقت کام نہ کرنا اور سیاسی قیادت کی غفلت اور سرد مہری پر توجہ دے کر ان کی اصلاح کرنا ہوگی۔ سیاسی قیادت نے اس واقعے کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی۔ ان کا فرض تھا کہ سب کام چھوڑ کر وہاں پہنچتے اور پہنچ کر اس معاملے کی تحقیقات کرتے۔ ان کے اس طرز عمل سے سب کو معلوم ہوتا کہ ہم ان تمام چیزوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

جناب والا! ان الفاظ کے ساتھ میں ایک بار پھر اس واقعے کی مذمت کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جائے گا بلکہ جو اصل ذمہ دار ہیں ان کو قرار واقعی سزا بھی ملے گی۔ اسی طریقے سے ہم آئندہ اس قسم کے واقعات کا تدارک کر سکتے ہیں۔

عاشورہ ہم سب کا ہے، امام حسینؓ ہم سب کے ہیں۔ اس دن کی تقدیس کو جس طریقے سے پامال کیا گیا ہے اور معصوم انسانوں کا خون بہایا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ پوری قوم کے لیے اور امت کے لیے ایک چیلنج ہے جس کا ہمیں مثبت جواب دینا چاہیے۔ (۳مارچ ۲۰۰۴ء)

منی لانڈرنگ اور دہشت گردی کی روک تھام کے لیے قانون سازی

۱۹۹۷ء میں اقوام متحدہ نے منی لانڈرنگ کو روکنے کے لیے ایک گلوبل پروگرام کا اعلان کیا۔ ۱۹۹۸ء میں منی لانڈرنگ کے خلاف اقوام متحدہ کے لائحہ عمل کے تحت رکن ممالک کو قانون سازی، بین الاقوامی تعاون، سخت مالی نظم و ضبط، بنکنگ معلومات خفیہ نہ رکھنے کے قوانین اور اقوام متحدہ کی ہدایات پر عمل کا پابند بنایا گیا۔

پاکستان میں ۱۹۹۷ء میں منشیات کی اسمگلنگ کی روک تھام کا قانون بنا اور دہشت گردی کے خلاف قانون میں منی لانڈرنگ کو شامل کیا گیا۔ اس کے بعد ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۶ء اور ۲۰۱۰ء میں منی لانڈرنگ کے قوانین بنائے گے یا پہلے سے موجود قوانین میں تبدیلیاں کی گئیں۔

۲۰۱۰ء میں اسی موضوع پر قانون سازی کے حوالہ سے بحث کے دوران پروفیسر خورشید احمد نے واضح کیا کہ اصولاً وہ منی لانڈرنگ کو روکنے کی ہر کوشش کے حق میں ہیں۔ البتہ زیر بحث بل کے بارے میں انہوں نے متوجہ کیا کہ بل بیرونی (امریکی) دباؤ کی بنیاد پر آیا ہے اور حکومت اس بناء پر عجلت میں کارروائی کر رہی ہے۔ انہوں نے منی لانڈرنگ کی تعریف اور اس کے معاشی، سیاسی اور قانونی پہلوؤں کو مد نظر رکھنے پر زور دیا۔

دوسری جانب ۱۴-۲۰۱۳ء میں دہشت گردی کی روک تھام کے لیے ایک سابقہ قانون میں ترمیم اور تحفظ پاکستان ایکٹ کی منظوری دی گئی۔ پروفیسر خورشید احمد کی ان حوالوں سے لکھی جانے والی دو تحریریں بھی اس مضمون کا حصہ ہیں۔ ان تحریروں میں انہوں نے متوازی نظام عدل پر تنقید کرتے ہوئے واضح کیا کہ ان قوانین کی مختلف دفعات کس طرح انسانی حقوق کے خلاف ہیں جبکہ تحفظ پاکستان ایکٹ ۲۰۱۴ء اور سابقہ آرڈیننس کا موازنہ کرنے کے ساتھ ساتھ نئے ایکٹ میں کم از کم آٹھ بڑے نقائص کی نشان دہی کی ہے۔

جناب والا! مجھے فخر ہے کہ میں، چیئرمین مجلس قائمہ برائے مالیات، آمدن، اقتصادی امور، شماریات اور منصوبہ بندی وترقیات کی جانب سے منی لانڈرنگ روکنے کے قانون (اینٹی منی لانڈرنگ بل ۲۰۱۰ء) پر کمیٹی کی رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔

جناب چیئرمین! میں کمیٹی کے جانب سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اس بل کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے درمیان تقریباً اتفاق تھا کہ اس میں بڑے اور موٹے موٹے سقم ہیں۔ یہ سقم تعریف کے بھی ہیں اور جو اس وقت کی عالمی فضا ہے اس کے زیر اثر ہونے کی بناء پر بھی اس میں کئی سقم پیدا ہو گئے ہیں، جس کی بناء پر یہ Privacy، یعنی بینکنگ قوانین سے متصادم ہیں۔ اس کے باوجود ہم نے اس کو صرف اس ضمانت پر منظور کیا کہ اگر یہ نہ کیا جائے تو پھر پاکستان کی بین الاقوامی ریٹنگ نیچے چلی جائے گی اور اس کے لیے تلوار لٹک رہی ہے۔ چنانچہ ساتھ ہی ہم سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ فوری طور پر ایک ماہ کے اندر سینیٹ کی کمیٹی کے ساتھ وزارت خزانہ کے متعلقہ ممبرز کو ملا کر ایک کمیٹی قائم کی جائے گی اور اس میں جو ترامیم طے پائیں گی وہ ایک سال کے اندر اس قانون میں شامل کی جائیں گی۔ اس یقین دہانی پر ہم نے اس کو پیش کیا ہے۔ (۲۶ فروری ۲۰۱۰ء)

منی لانڈرنگ بل

جناب چیئرمین! میرے ساتھی سینیٹر نے ہم سب کی توجہ ایک بڑے اہم مسئلے کی طرف مبذول کرائی ہے اور یہ مسئلہ حکمرانی کی عدم موجودگی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک معاملہ میں متعلقہ وزیر اور وزیر اعظم کے احکام بھی موجود ہیں لیکن اس کے باوجود انتظامیہ کا ایک نمائندہ ملک کے مفاد میں طے کی ہوئی چیزوں کو چلنے کا موقع نہیں دے رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ جناب وزیر محترم اس مسئلے کو کابینہ میں اٹھائیں، اس لیے کہ کابینہ کس لیے ہے؟ اور پھر اگر وزیر اعظم بھی غیر مؤثر ہیں تو ان کے لیے عزت کا راستہ وزارت عظمیٰ پر بیٹھنا نہیں بلکہ قوم کو یہ حقائق بتانا اور اس طرح کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔ یہ آپ

کے اپنے اختیارات کو استعمال نہ کرنے کی ایک مثال ہے۔ دوسروں کو آپ جتنا چاہیں دوش دیں لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ وزیر یا وزیر اعظم ہونے کے باوجود آپ کی بات نہیں چل رہی۔ یہ حکمرانی کی غیر موجودگی ہے اس لیے اس کا اس پہلو سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

جناب والا! جہاں ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے، وہیں ہمیں یہ بات بھی دکھ سے کہنی پڑتی ہے کہ منی لانڈرنگ بل کوئی معمولی بل نہیں ہے، اس کے معاشی، قانونی اور سیاسی تینوں نتائج ہیں۔ ہم اصولاً منی لانڈرنگ بل کے خلاف نہیں ہیں، اس پر قانون یقینی طور پر ہونا چاہیے لیکن جس طرح امریکہ نے ۹/۱۱ کے بعد منی لانڈرنگ کے نام پر اپنی مالیاتی آمریت قائم کی ہے اور ایک قسم کی مالیاتی دہشت گردی پوری دنیا پر مسلط کر دی گئی ہے، یہ بل اسی کا ایک نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنے تئیں ایک ماڈل بنایا ہے جسے ہر جگہ وہ زبردستی مسلط کر رہے ہیں۔ مجھے دکھ ہے کہ ہم نے اس پوری بحث اور اس کے تمام عواقب اور نتائج کو سمجھے بغیر ہی اسے منظور کر لیا ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے اور ہمیں اس بات پر شدید احتجاج ہے ہم نے اس بات کا ایک بار نہیں بار بار اظہار کیا ہے۔

جب پہلی مرتبہ بل یہاں آیا تو حکومت کی خواہش تھی کہ اسی دن منظور کر لیا جائے، ہم نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ہم ہی نے اسے فنانس کمیٹی میں بھیجا۔ میں فنانس کمیٹی کا ممبر ہوں، آپ نے اس کے بارے میں فنانس کمیٹی کی رپورٹ دیکھی ہے، اس میں ہم نے کم از کم ۸ یا ۱۹ اعتراضات اٹھائے ہیں اور واضح کیا ہے کہ پارلیمنٹ کی موجودگی میں اس بل کو منظور کرنا ہماری قوم اور ہماری معیشت کے مفاد میں نہیں ہے۔ لیکن اس سب کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور پھر آج مناسب بحث کے بغیر اسے منظور کیا جا رہا ہے۔

ایسا نہیں کہ ہم بحث کے لیے یہاں موجود نہیں تھے۔ آپ کے علم میں ہے کہ ہم ایک سرکاری کام، جو اس پارلیمنٹ ہی کا کام ہے، کر رہے تھے، ہم کہیں چھٹی پر یا باہر نہیں گئے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہم سب اسی پارلیمنٹ کی ایک بہت اہم کمیٹی میں مصروف تھے ہم نے یہ بات کہی کہ بل کو اس طریقے سے روندا نہ جائے۔ ہم نے اپیل کی کہ اس میں

جو کھیل کھیلا جارہا ہے اس کو بے نقاب کیجیے، تاکہ ہم امریکہ کے دباؤ سے نکلیں۔ حقیقی کرپشن کو روکنے کے لیے جو ذرائع درکار ہیں ان پر عمل ہونا چاہیے لیکن اس کو بہانا بنا کر ایک ایسے نظام میں لوگوں کو جکڑنا کہ جس سے معاشرے کا حقیقی تعامل متاثر ہو، اور جس سے مختلف پیشہ ور خواہ وہ اکاؤنٹینٹس ہوں یا وکلاء اپنے اصولوں پر راست بازی سے قائم نہ رہ سکیں، تو یہ انسانی حقوق کے بھی خلاف ہے اور یہ ہمارے قومی مفاد کے بھی خلاف ہے۔

اس لیے ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ ہمارے تمام ساتھی جو اس پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ آپ انہیں موقع دیں گے، اس کے بعد ہم اس پر احتجاجاً واک آؤٹ کریں گے۔

میں ایک بات کی وضاحت چاہتا ہوں کہ وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے کہا ہے کہ اس قانون کا ڈرافٹ اقوام متحدہ نے دیا ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں وہ ڈرافٹ دکھایا جائے۔ میں نے جو کچھ پڑھا ہے وہ یہ ہے کہ بلاشبہ اقوام متحدہ کی ایک قرارداد موجود ہے لیکن اس قرار داد کی روشنی میں یہ مسودہ قانون امریکہ اور دوسرے ممالک نے بنایا ہے۔ اقوام متحدہ نے اس کا کوئی نمونہ نہیں دیا اور اگر دیا ہے تو وہ ہمیں فراہم کیا جائے۔ (۲۲ مارچ ۲۰۱۰ء)

دہشت گردی کے خلاف قانون میں تبدیلی اور تحفظ پاکستان آرڈیننس

دہشت گردی کی جس آگ میں ملک گذشتہ ۱۲ سال سے جل رہا ہے اور جس کی تپش اب مسلسل بڑھتی ہی جارہی ہے، اس سے نجات ملک کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ بدقسمتی سے یہ مسئلہ مختلف وجوہ سے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جارہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خود دہشت گردی کی نوعیت کو سمجھنے میں بڑا ذہنی انتشار ہے جسے بیرونی طاقتوں اور خصوصیت سے امریکہ کے کردار اور مفادات نے اور بھی اُلجھا دیا ہے۔

دہشت گردی کی نوعیت

ملک میں برپا دہشت گردی کے ایک بڑے حصے کا تعلق امریکہ کی افغانستان میں برپا نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اس میں پاکستان کی جونیئر پارٹنر کے طور پر شرکت سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے کے عسکری اور سیاسی پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور امریکہ کے افغانستان سے انخلا اور مسئلے کے سیاسی حل کے بغیر عسکریت کے خاتمے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ لیکن وہ دہشت گردی جس کی لپیٹ میں اس وقت پورا ملک آچکا ہے، اس میں کچھ دوسرے عناصر اور قوتیں بھی شریک ہیں اور ان میں علیحدگی پسند تحریکوں، علاقائی مفادات کا کھیل کھیلنے والی قوتوں، مذہبی اور مسلکی منافرت پھیلانے والے عناصر، بیرونی قوتوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والے تخریب کاروں اور پیشہ ور مجرموں، سب کا کردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہمہ جہتی حکمت عملی کی ضرورت ہے جس کی چھتری تلے ہر ہر نوعیت کی دہشت گردی کا اس انداز میں مقابلہ کیا جاسکے جس کا وہ تقاضا کرتی ہے اور جس کے نتیجے میں بالآخر امن وامان بحال ہوسکے۔

ان حالات میں ۹ ستمبر ۲۰۱۳ء کی کُل جماعتی کانفرنس نے متفقہ طور پر جو رہنمائی فراہم کی ہے، وہ بڑی حقیقت پسندانہ ہے مگر حکومت نے اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے آج تک کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی ہے، جب کہ مخالف قوتیں اس کے شروع ہونے سے پہلے ہی سبوتاژ کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ ایک طرف امریکہ اور اس کے گماشتوں کا کردار ہے جو فکری اور عملی، دونوں محاذوں پر سیاسی عمل کو پٹڑی سے اُتارنے (Derail) میں مصروف ہیں تو دوسری طرف کچھ عسکریت پسند گروہ بھی حالات کو بگاڑنے کے لیے بڑی چابک دستی کے ساتھ تباہ کاریوں اور خون خرابے میں سرگرم ہیں۔ ادھر حکومت کا یہ حال ہے کہ وہ اس خطرناک کھیل کا مقابلہ کرنے کے لیے پورے شعور اور زمینی حالات کے اِدراک کے ساتھ ایک فعال پالیسی اختیار کرنے کے بجائے گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہے اور ہمت اور حکمت دونوں کا مظاہرہ کرنے سے قاصر ہے۔

ان حالات میں ایک طرف وزیر اعظم (نواز شریف) امریکہ تشریف لے گئے ہیں اور دوسری طرف ان کی حکومت نے ۱۵ دن کے اندر دو آرڈیننس نافذ فرمائے ہیں جن میں سے ایک کے ذریعے ۱۹۷۹ء کے دہشت گردی کے خلاف قانون میں بنیادی تبدیلیاں کی گئی ہیں، اور دوسرے نئے آرڈیننس کا عنوان ہے: تحفظ پاکستان (Protection of Pakistan) آرڈیننس ۲۰۱۳ء۔ اس کا ہدف حکومت کی رٹ قائم کرنا اور ان عناصر کی سرکوبی کرنا ہے جن کو ملک دشمن تصور کیا جائے۔

قانون سازی کے اساسی تقاضے

دہشت گردی کے حوالے سے جو بھی قوانین ملک میں رائج ہیں، ان پر ضرورت کے مطابق نظر ثانی کوئی معیوب شے نہیں بلکہ کچھ حالات میں مطلوب بھی ہیں لیکن تین چیزیں ایسی ہیں جو تشویش کا باعث ہیں اور بڑے بڑے سوالیہ نشان اُٹھا رہی ہیں:

۱۔ ان قوانین کے نفاذ کا وقت۔

۲۔ دستور اور جمہوری روایات کے مطابق پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی کا راستہ ترک کر کے ۱۵، دن میں تابڑ توڑ دو آرڈیننسوں کے ذریعے ان کا نفاذ۔

۳۔ ان قوانین میں دستور میں طے کردہ اصولوں اور حدود کی نزاکتوں کو نظر انداز کر کے انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے افراد اور اداروں کے لیے ایسے بے قید اختیارات کا حصول جو بنیادی حقوق اور دستور کی دفعہ ۱۰ (الف) میں دی گئی، ضمانت Due process of law (ضروری قانونی عمل) کے حق سے ہم آہنگ نہیں۔

مذکورہ بالا تینوں نکات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ۱۰، اکتوبر اور ۲۰، اکتوبر ۲۰۱۳ء کو نافذ کیے جانے والے دونوں آرڈیننسوں میں جو اختیارات حاصل کیے گئے ہیں اور نظامِ عدل اور قانون کا جو نقشہ ان کے تحت بنتا ہے، اسے سمجھ لیا جائے۔

قوانین (آرڈیننسوں) میں کیا ہے؟

تحفظ پاکستان آرڈیننس کے تحت رنگ، نسل، قومیت یا مذہب سے قطع نظر خوف وہراس پھیلانے اور دہشت گردی کے مرتکب یا اس کا قصد کرنے والے افراد کو ریاست کا دشمن قرار دیا گیا ہے۔ ایسے افراد کو محض سرکاری اطلاعات کی بنیاد پر گرفتار کیا جاسکتا ہے اور تین مہینے تک قانون نافذ کرنے والے اداروں کی تحویل میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس آرڈیننس کے تحت دہشت گردی کے واقعات کی تحقیقات میں سیکورٹی اور قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے تعاون کر سکیں گے اور گمان غالب کی بنیاد پر بھی کارروائی ہو سکے گی، نیز قانون نافذ کرنے والے افراد کو وارنٹ کے بغیر تلاشی اور ہر مقام تک رسائی کا اختیار حاصل ہو گا، اور مزاحمت کی شکل میں یا اس کے خدشے کی صورت میں بھی قوت کے استعمال کا استحقاق ہو گا۔ پھر جن پر جرم ثابت ہو، ان کو کڑی سزا دی جاسکے گی جو کم از کم ۱۰ سال قید پر مشتمل ہو گی۔ سنگین مجرموں کے لیے خصوصی جیلیں بنیں گی۔ مخصوص جرائم کے مقدمات کے جلد اندراج اور فوری تحقیقات کے لیے الگ تھانے ہوں گے اور آرڈیننس کی دفعہ ۳۷ کے تحت ان مقدمات کی سماعت کے لیے خصوصی وفاقی عدالتیں تک قائم کی جائیں گی۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ سول اور فوجی اہل کاروں کو اپنے فرائض کی بجاآوری میں آئینی اور قانونی تحفظ حاصل ہو گا اور ان کے احتساب اور نگرانی کا کوئی نظام اس نئے قانون کا حصہ نہیں ہے۔

تحفظ پاکستان آرڈیننس سے ۱۰ دن پہلے جو آرڈیننس اینٹی ٹیررزم ایکٹ میں بنیادی ترامیم کے بعد نافذ کیا گیا تھا اس کے تحت گواہوں کو اور عدلیہ کو خصوصی تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور نئی ٹیکنالوجی کو تفتیش کے لیے استعمال کرنے کا دروازہ کھول دیا گیا ہے جس میں وڈیو ٹیپس اور فرانزک شواہد کو بطور شہادت استعمال کرنا شامل ہے۔ اسی طرح وڈیو لنکس کے ذریعے مقدمات کی سماعت کی گنجائش پیدا کر دی گئی ہے اور حکومت کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا ہے کہ وہ ملک کے کسی بھی علاقے میں درج دہشت گردی کے کسی بھی مقدمے کو ملک کی

کسی بھی عدالت میں منتقل کر سکتی ہے۔

ان قوانین کے تحت قانون نافذ کرنے والے تمام افراد اور اداروں کو جن کا تعلق رینجرز، فرنٹیئر کور، فرنٹیئر کانسٹیبلری یا کسی بھی دوسرے ادارے سے ہو، پولیس کے مکمل اختیارات حاصل ہوں گے اور وہ بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان، دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ ہی نہیں، خوف وہراس پھیلانے والے عناصر کو بھی اپنی گرفت میں لے سکیں گے۔

قوانین پر بحث: بلاشبہ دہشت گردی اور اس کی مختلف شکلوں سے نبٹنے کے لیے قانون کا مؤثر ہونا اور قانون نافذ کرنے والوں، گواہی دینے والوں اور عدلیہ کو معقول اور قرار واقعی تحفظ حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن یہ پہلو جتنا اہم ہے اتنا ہی اہم یہ پہلو بھی ہے کہ تمام انسانوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ اور قانون کے تحت مکمل انصاف کے حصول کو یقینی بنایا جائے اور قانون کے غلط استعمال کے ہر دروازے کو بند کر دیا جائے۔ دہشت گردی کسی بھی شکل میں ایک گھناؤنا جرم ہے، لیکن دہشت گردی اور خوف و ہراس پھیلانے کے نام پر ایک بھی معصوم انسان کا نشانہ بنایا جانا بھی اتنا ہی گھناؤنا جرم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مناسب Checks & Balances کے بغیر اور ہر کسی کے لیے قانون کے اندر جواب دہی (Accountability) کے مؤثر نظام کے بغیر معاشرے میں نہ عدل قائم ہو سکتا ہے اور نہ امن وامان اور عزت اور جان ومال کا تحفظ یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں میں توازن ضروری ہے۔

یہ ضرورت ایک وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں مسلسل بگاڑ کے باعث جس طرح عوام کے ایک حصے میں جرم کے رجحانات میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، اسی طرح یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جن افراد اور اداروں پر قانون نافذ کرنے کی ذمہ داری ہے، ان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو شتر بے مہار بن گئے ہیں اور کرپشن اور ظلم و زیادتی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ امر ہے کہ عوام دونوں طرف سے پس رہے ہیں۔ مجرموں کا بھی وہ نشانہ ہیں اور پولیس اور قانون نافذ کرنے والے افراد میں ایسے لوگ خاصی تعداد میں موجود ہیں جو آلۂ ظلم بن گئے ہیں اور عملاً اپنے کو قانون سے بالا تصور کرتے ہیں بلکہ

ان کا زعم ہے کہ وہ خود ہی قانون ہیں۔ معاذ اللہ! یہی وجہ ہے کہ جس قسم کے غیر معمولی وسیع اختیارات ان آرڈیننسوں میں سرکاری اہل کاروں کو دیے گئے ہیں، ان پر بہت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح خصوصی وفاقی عدالتوں کے قیام کا جو تصور ان میں دیا گیا ہے، اور وفاقی نظام میں نئے پولیس اسٹیشنوں اور خصوصی جیلوں کے قیام کی بات کی گئی ہے، وہ اپنے اندر بڑے دُوررس مضمرات کی حامل ہے۔ اس کے نتیجے میں دو متوازی نظام ہائے عدل کے قائم ہونے کا خطرہ ہے جو دستور کے ڈھانچے سے واضح متصادم ہو گا، اور جس کی کوشش اس سے پہلے بارھویں ترمیم کی شکل میں میاں نواز شریف کے پہلے دورِ حکومت میں کی گئی تھی مگر پارلیمنٹ اور عدالت دونوں نے اسے رد کر دیا تھا۔

اس تلخ تجربے کے باوجود اس نئے آرڈیننس کے ذریعے ایک ایسی تجویز کو کتابِ قانون میں داخل کرنا جس کے دُوررس منفی اثرات ہوں، حکمت اور عدل دونوں کے تقاضوں پر پورا نہیں اُترتا۔ انسداد دہشت گردی قانون کے تحت انسداد دہشت گردی کی عدالتیں موجود ہیں۔ اگر ان کی تعداد کم ہے تو انھیں بڑھایا جاسکتا ہے۔ اگر ان میں کچھ دوسری اصلاحات کی ضرورت ہے تو وہ بھی اس قانون کے دائرے میں ہی کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ایک طرف صوبائی قانون کے تحت انسدادِ دہشت گردی کی عدالتیں ہوں اور دوسری طرف وفاقی عدالتیں ہوں اور فیڈریشن کو یہ اختیار بھی ہو کہ جس مقدمے کو جس عدالت اور جس صوبے سے جہاں چاہے منتقل کر دے، اس میں بڑے خطرات پوشیدہ ہیں۔ ہماری نگاہ میں یہ دروازہ کھولنا محلِ نظر ہے۔

ان دونوں آرڈیننسوں کو دستور کی متعلقہ دفعات اور عدل و انصاف اور ہر فرد کے بنیادی حقوق اور حق دفاع کی دستوری ضمانتوں کی میزان پر پرکھنا ہو گا۔ نیز فیڈریشن کے مسلّمہ اصولوں اور خصوصیت سے اٹھارھویں ترمیم کے بعد جو نقشہ مرکز اور صوبوں کے اختیارات کا بنا ہے، اس کسوٹی پر بھی ان کو پرکھنا ہو گا۔ جلد بازی میں اور دہشت گردی کا ہوّا دکھا کر ایسی قانون سازی جو بنیادی حقوق سے متصادم ہو، جمہوریت اور اسلام دونوں کے

مقاصد اور مزاج سے متصادم ہو گی۔

تحفظ پاکستان آرڈیننس میں دہشت گردی کو قانون کے ذریعے ختم کرنے اور فوج داری قانون کے ذریعے اس کا مقابلہ کر کے معروف راستے سے ہٹ کر جارج بش اور امریکی انتظامیہ کے وضع کردہ War Paradigm (بہ مثل جنگ) کو بھی پہلی مرتبہ پاکستان کی کتابِ قانون میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جسے کسی شکل میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔ دہشت گردی ایک جرم ہے اور ایک جرم ہی کی حیثیت سے اس کا قلع قمع کیا جانا چاہیے۔ اسے جنگ قرار دے کر انتظامیہ کے لیے شتر بے مہار بن جانے کے مواقع فراہم کرنا بے حد خطرناک ہے۔ امریکہ نے جو کچھ گذشتہ ۱۲ برسوں میں کیا ہے اس کی موجودگی میں یہ کوشش کہ یہ تصور ہماری کتابِ قانون میں بھی جگہ پالے، بے حد خطرناک اور ناقابلِ قبول ہے۔

اس آرڈیننس میں جس طرح دہشت گردی کو پاکستان کے خلاف جنگ کا آغاز (Waging of war against Pakistan) کے انداز میں پیش کیا گیا ہے، وہ اپنے اندر بہت دُوررس مضمرات رکھتا ہے۔ اسی طرح جرم کے 'معقول خدشے' (Reasonable apprehension of a scheduled offence) کو قوت کے استعمال کے لیے کافی قرار دے دیا گیا ہے۔ قوت کے استعمال کا یہ اختیار بھی ماضی کے تجربات کی روشنی میں اپنے اندر بڑے خدشات لیے ہوئے ہے۔ بلاشبہ خاطر خواہ تنبیہ (Sufficient warning) کی بات بھی کہی گئی ہے لیکن محض خدشے کی بنیاد پر قوت کا ایسا استعمال جس میں جان ضائع ہو جائے، ایک ایسا اختیار ہے جس کے غلط استعمال کا بڑا خطرہ ہے اور جو ظلم و زیادتی کا راستہ کھولنے کا باعث ہو سکتا ہے جیسا کہ 'پولیس مقابلہ میں مارے جانے' کے نام پر ماضی میں ہوتا رہا ہے۔

اسی طرح جہاں جرم کے ثبوت کے لیے نئی ٹیکنالوجی کا استعمال مفید ہو سکتا ہے، وہیں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ سرکاری اداروں کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ

معاشرے کے تمام افراد کی نجی زندگی (Privacy) کو مجروح کرنے کے حربے استعمال کریں اور ٹیلی فون اور ای میل میں مداخلت کریں جس کے نتیجے میں ایک مہذب معاشرہ ایک پولیس اسٹیٹ بن جاتا ہے۔ فرد کی آزادی ایک سراب بن جاتی ہے اور چادر اور چار دیواری کا تقدس پامال ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں گذشتہ ۱۲ برسوں میں امریکہ نے جس طرح خود اپنے شہریوں اور دنیا کے دوسرے انسانوں، اداروں اور حکومتوں کے ڈھکے اور چھپے سب ہی معاملات پر جاسوسی کے ذرائع سے رسائی حاصل کی ہے اس نے خود مغربی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ وکی لیکس اور اب سنوڈین کے ذریعے جو معلومات سامنے آئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ امریکی خفیہ ایجنسیوں نے دوست اور دشمن، سب ہی کی نجی زندگی کو پامال کیا ہے، اور دوسروں کے گھروں تک ہی رسائی حاصل نہیں کی ہے بلکہ حکومتوں کے پالیسی سازی کے اداروں کو بھی اپنی الیکٹرانک مداخلت کا نشانہ بنایا ہے جس پر امریکہ کے قریب ترین دوست ملک بھی چیخ اُٹھے ہیں۔ ان دونوں آرڈیننسوں میں شہادت کے لیے جن چیزوں کو معتبر کہا گیا ہے اس سے یہاں بھی ایک ریاستی نگرانی کے قیام کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اُٹھانا ضروری ہے لیکن اس باب میں صحیح حدود کا تعین بھی ضروری ہے جس کا کوئی اشارہ ان قوانین میں نظر نہیں آتا۔

ہم حکومت، پارلیمنٹ کے ارکان، وکلا برادری اور خصوصیت سے انسانی حقوق کی علم بردار تنظیموں کو دعوت دیتے ہیں کہ ان قوانین پر انسانی حقوق اور عدل اور قانون کی حکمرانی کے مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں غور کریں۔ محض طالبان دشمنی کے جذبے میں قانون میں ایسی چیزوں کو دَر آنے کا موقع نہ دیں جو معاشرے کی بنیادوں کو ہلا دیں، اور جو ریاست کے اداروں کو حقوق کی پامالی کے لیے کھلی چھٹی دے دیں۔ یاد رہے کہ آج نشانہ جو بھی ہو، کل ہم میں سے ہر ایک نشانے پر آسکتا ہے۔ اس وقت تو ہمارے وہ دوست جو اپنے آپ کو لبرل کہتے ہیں بڑے جوش سے کہہ رہے ہیں کہ ”طالبان کو مارو اور بھسم کر دو“ لیکن

ریاست کو مضبوط کرنے (Strengthening of the State) کے نام پر جو اختیارات ان اداروں کو آج آپ دے رہے ہیں، کل وہ کس کس کے خلاف اور کہاں کہاں استعمال ہو سکتے ہیں، اس سے خدارا صرفِ نظر نہ کریں۔

ہم یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دونوں قوانین کو آرڈیننس کے ذریعے ملک پر مسلط کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ۱۱ مئی کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے چار اجلاس ہو چکے ہیں۔ قانون سازی کے باب میں موجودہ اسمبلی کی اب تک کی کارکردگی صفر رہی ہے۔ ان چار ماہ میں اسمبلی میں صرف تین سرکاری بل قانون سازی کے لیے تجویز کیے گئے ہیں، جب کہ حکومت کے تین کے مقابلے میں چار پرائیویٹ بل غور کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ گو ابھی تک سرکاری یا غیر سرکاری کوئی ایک بھی بل کتابِ قانون کا حصہ نہیں بن سکا ہے۔ توقع ہے کہ ایک ہفتے میں قومی اسمبلی کا اجلاس ہونے والا ہے۔ ایسی کیا عجلت تھی کہ دو ہفتے کے عرصے میں دو آرڈیننس جاری کر دیے گئے اور ایک ہفتہ مزید انتظار نہیں کیا گیا کہ اسمبلی ان قوانین پر پوری طرح غور و خوض کر لیتی، کمیٹیوں میں ان پر تفصیلی بحث ہو سکتی۔ پریس اور پبلک دونوں ہی کے لوگ ان قوانین کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور اس طرح افہام و تفہیم اور بحث و مشاورت کے نتیجے میں پارلیمنٹ اور سول سوسائٹی کے تعاون سے دستور کی روح کے مطابق مناسب قانون سازی کی جا سکتی۔

ماضی میں ہم سب نے بشمول مسلم لیگ (ن) آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی کی مخالفت کی ہے۔ اٹھارہویں دستوری ترمیم میں آرڈیننس کی تجدید کے بارے میں کچھ پابندیاں بھی اس طریقِ قانون سازی کو مشکل بنانے کے لیے عائد کی گئی ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اس ناپسندیدہ طریقے کو جس کا جواز صرف حقیقی ایمرجنسی میں ہی ہو سکتا ہے، اختیار کیا گیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تحفظ پاکستان آرڈیننس میں تو یہ عجیب و غریب تضاد بھی موجود ہے کہ ایک طرف اسے فوری طور پر اور پورے ملک میں آرڈیننس کے ذریعے نافذ کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس کے عملی نفاذ کے معاملے کو کھلا چھوڑ دیا گیا

ہے جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایسی کوئی فوری ایمرجنسی نہیں تھی کہ اسے اسمبلی سے بالا ہی بالا نافذ کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو دفعہ ۳، جس میں صاف لکھا ہے کہ: ''یہ ایسی تاریخ یا تاریخوں سے نافذ العمل ہو گا جو وفاقی حکومت اس بارے میں طے کرے، نیز اس آرڈیننس کی مختلف شقوں کے نفاذ کے لیے مختلف تاریخیں بھی مقرر کی جاسکتی ہیں''۔

اختیارات تو لے لیے گئے ہیں لیکن نفاذ کو ابھی معلق رکھا گیا ہے، گویا ان کے استعمال کی کوئی فوری ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت جلدی میں پارلیمنٹ میں بحث کے بغیر غیر معمولی اختیار لے لیا گیا ہے اور اب یہ مرکزی حکومت کی صوابدید ہے کہ اس کو جب اور جتنا نافذ کرنا ہو، کر سکے۔ اگر فوراً ہی اسے نافذ نہیں کیا جارہا تو پھر ایسی جلدی کیا تھی کہ اسمبلی کو نظر انداز (Bypass) کیا جائے اور جو قانون اسمبلی کے ذریعے چند ہفتوں میں منظور کرایا جاسکتا ہے وہ اُوپر سے مسلط کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں اشارہ کیا کہ ایک پہلو ان قوانین کے نفاذ کے وقت کا بھی ہے۔ ایک طرف آپ مذاکرات کی بات کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ جنگ کے اعلان کی تیاریاں کر رہے ہیں اور تلواریں سونت کر اکڑفوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اسے انگریزی محاورے میں ایک ہی سانس میں گرمی و سردی دکھانے کو (Blowing hot and cold in the same breath) کہتے ہیں جو کبھی بھی اچھی حکمت عملی نہیں ہوتی۔

اصل مسئلہ: قانون کا احترام نہ ہونا: آخیر میں ہم ایک بنیادی بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اصل مسئلہ قانون کی موجودگی کا نہیں، قانون کے احترام اور اس کے عملی نفاذ کا ہے۔ دہشت گردی کے مقابلے کے لیے ۱۹۹۷ء سے قانون موجود ہے جس میں ایک درجن سے زیادہ ترامیم ہو چکی ہیں اور مزید بھی ہو سکتی ہیں، لیکن عملاً اس پر اور دوسرے قوانین پر عمل نہیں ہو رہا۔ پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے اور افراد اپنی صلاحیت کار کے اعتبار سے وقت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ سروسز میں کرپشن نے گھر کر لیا ہے اور سیاسی بنیادوں پر تقرریوں نے ان کی وفاداری، ساکھ اور کارکردگی

ہر ایک کو تباہ کر دیا ہے۔ ٹیکنالوجی اور ٹریننگ دونوں کے اعتبار سے وہ بہت خام ہیں اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ حکومتوں کا اپنا رویہ بھی صاف ستھرا (Above board) نہیں۔ وہ دستور، قانون اور قومی مفاد کے مقابلے میں ذاتی اور گروہی مفادات کو فوقیت دیتے ہیں۔ پولیس میں ہزاروں کی تعداد میں سیاسی بنیادوں پر یا رشوت لے کر تقرریاں ہوئی ہیں اور ہر برسرِ اقتدار پارٹی نے اپنے اپنے دور میں بہتی گنگا میں خوب خوب ہاتھ دھوئے ہیں۔ اسی طرح مالی وسائل اور بجٹ کا مسئلہ بھی ہے۔ اگر پولیس تفتیش اور جیلوں اور عدالتوں کا ایک نیا ملک گیر نیٹ ورک پیش نظر ہے تو اس کے لیے مالی وسائل کہاں سے آئیں گے؟

اگر مذکورہ تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے اور قانون پر قانون بنائے جائیں تو اس سے تبدیلی اور خیر کی توقع عبث ہے۔ اتنے اہم مسئلے پر جلد بازی سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ پارلیمنٹ اور میڈیا دونوں ان تمام اُمور پر کھل کر بحث کریں۔ وکلا برادری اور سیاسی اور سول سوسائٹی کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیا جائے اور اس طرح وسیع تر قومی مشاورت سے ان نازک اُمور پر مناسب قانون سازی کی جائے۔ مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمارے حکمرانوں کو اپنے طور طریقے بدلنا ہوں گے اور وہ راستہ اختیار کرنا ہو گا جو حقیقی مشاورت پر مبنی ہو۔ اس میں سب کے لیے خیر ہے۔

آرڈیننس کے بعد تحفظ پاکستان ایکٹ (۲۰۱۴ء)

دہشت گردی کی روک تھام اور دہشت گردی کے جرائم پر قانون کی گرفت کو مؤثر بنانے کے لیے قرار واقعی اقدام کی ضرورت نہ پہلے متنازع تھی اور نہ آج ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ قانون سازی میں اصل ضرورت سیکورٹی اور عدل و انصاف اور قانون کی بالادستی..... دونوں کے تقاضوں کو بیک وقت ملحوظ رکھا جائے۔ کسی ایک طرف جھکاؤ ظلم کی ایک شکل ہے جو دستورِ پاکستان، اصولِ قانون اور شریعت، سب سے متصادم ہے اور کوئی بھی مہذب

معاشرہ، چہ جائیکہ ایک اسلامی معاشرہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

نواز شریف حکومت نے اپنی مصالح یا مجبوری کے تحت کچھ عرصہ قبل (اکتوبر ۲۰۱۳ء میں) دو قوانین بذریعہ آرڈیننس جاری کیے تھے، جن میں سے ایک دہشت گردی کے خلاف قانون میں ترامیم اور دوسرا 'تحفظِ پاکستان' کے نام پر ایک نیا Draconian (اژدہائی) قانون تھا، جن پر ملک کے گوشے گوشے سے شدید تنقید ہوئی اور حقوقِ انسانی کی عالمی تنظیموں نے بھی انھیں تنقید کا نشانہ بنایا۔ ہم نے بھی ان قوانین پر گرفت کی اور تین بنیادوں پر اسے ایک ظالمانہ اور خلافِ دستور و شریعت اقدام قرار دیا:

۱۔ پارلیمنٹ کو نظر انداز کر کے آرڈیننس کے ذریعے عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا۔

۲۔ مذاکرات کے عمل کو فروغ دینے کے دعووں کے ساتھ ایسے اختیارات حاصل کرنا جو سرکاری اہتمام میں صریح ظلم کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔

۳۔ ان قوانین کا دستورِ پاکستان، مسلّمہ اصولِ قانون اور شریعت کے اصول و ضوابط سے متصادم ہونا۔

حکومت نے اب پارلیمنٹ کے ذریعے قانون سازی کا راستہ اختیار کیا ہے، جس کا ہم اصولی طور پر خیر مقدم کرتے ہیں۔ البتہ پارلیمنٹ سے شکایت ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کی اور سیاسی سمجھوتہ کاری اور بیرونی دباؤ کے آگے سپر ڈال دینے کی روش اختیار کر کے، عوام کے حقوق کے تحفظ کے باب میں اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔ قومی اسمبلی نے پہلے ہی دن سے تحفظِ پاکستان بل کے سلسلے میں سہل انگاری اور سمجھوتہ کاری کا راستہ اختیار کیا۔ پیپلز پارٹی، جمعیت علمائے اسلام (ف)، ایم کیو ایم اور اے این پی نے بظاہر مخالفت کا رویہ اختیار کیا، لیکن سیاسی مصلحتوں اور مراعات کے سائے میں چند جزوی اور غیر مؤثر ترامیم کا سہارا لے کر قانون کی تائید کا راستہ اختیار کر لیا اور یہی رویہ سینیٹ کا رہا، جس نے پہلے تو بہت شور شرابا برپا کیا اور چیلنج کیا کہ اس بل کو ہرگز

منظور نہیں ہونے دیں گے، لیکن پھر ایک دم ہتھیار ڈال دیے۔

تحریکِ انصاف نے اصولی مخالفت کی مگر رائے شماری کے وقت وہ بھی صرف غیر جانب دار ہوگئے۔ صرف جماعت اسلامی کے ارکان نے اس بل کی مخالفت کی، اس کے خلاف ووٹ دیا اور اب اس کے قانون بن جانے کے بعد اسے عدالتِ عظمیٰ میں بھی چیلنج کیا ہے۔

دوسرا پہلو ان قوانین کے نفاذ کے وقت کے بارے میں تھا جو اب بڑی حد تک غیر متعلق (Irrelevant) ہوگیا ہے۔ بہت سا پانی پُلوں کے نیچے بہہ چکا ہے اور شمالی وزیرستان میں آپریشن کا آغاز ہوگیا ہے۔ ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس آزمائش میں ملک، ہماری افواج، پاکستانی عوام خصوصیت سے متعلقہ علاقے (سوات) کے ۱۰ لاکھ سے زیادہ بے گھر ہونے والے ہمارے بھائیوں، بہنوں اور بچوں کی حفاظت کرے اور ان کی اپنے گھروں کو جلد واپسی ہو۔

تیسری بنیاد دستور، اصولِ قانون اور شریعت کے اصول وضوابط سے تصادم تھی، جو چند ترامیم کے باوجود بہت بڑی حد تک اس قانون میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر چند ترامیم کے ذریعے کچھ دانت توڑنے کے عمل کے باوجود ہم اسے ایک کالا قانون اور ظلم کا آلہ تصور کرتے ہیں۔ پاکستان کے حقوقِ انسانی کمیشن اور عالمی اداروں میں ہیومن رائٹس واچ نے بھی اسے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اول الذکر نے اسے بجاطور پر ایک اژدہائی قانون (Draconian Law) قرار دیا ہے، اور ہیومن رائٹس واچ نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ عام شہریوں کے دستوری اور بنیادی حقوق کی پامالی کا اس میں بے حد سامان موجود ہے۔ ڈان اور ایکسپریس ٹریبیون نے اپنے ۱۳ جولائی ۲۰۱۴ء کے اداریوں میں ترمیم شدہ قانون کو بھی غیر تسلی بخش اور دستور کے خلاف قرار دیا ہے۔

تحفظ پاکستان ایکٹ ۲۰۱۴ء اور سابقہ آرڈیننس کا موازنہ

ایکٹ کے ذریعہ جو ترامیم کی گئی ہیں انھیں ایک حد تک مثبت قرار دیا جاسکتا ہے لیکن

وہ بے حد ناکافی اور ان بنیادی اعتراضات کو دُور کرنے میں بُری طرح ناکام رہی ہیں، جن کی بنا پر اس ظالمانہ قانون پر ہم نے اور بنیادی حقوق کا تحفظ کرنے والے اداروں نے شدید تنقید کی تھی۔ ان ترامیم میں سے ایک کا تعلق 'جنگی دشمنوں' (Enemy combatant) کے تصور سے ہے، جسے اب نکال دیا گیا ہے اور دہشت گردی کی دو شکلوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یعنی 'بیرونی یا خارجی دشمنوں' (Enemy alien) اور 'جنگجوؤں' (Militant)۔ اول الذکر کا تعلق دہشت گردی کے مرتکب غیر شہریوں سے ہو گا، اور دوسرے ملک کے شہریوں سے۔ یہ ترمیم بہتر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ترمیم شدہ شکل میں بھی 'Alien' (بیرونی) کی تعریف میں جھول ہے اور اس میں Combatant ('جنگی') کے عنصر کو شامل نہیں کیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں ہر کوئی 'بیرونی' دشمن اور دہشت گرد شمار ہو سکتا ہے، جو انصاف اور بنیادی حقوق کے تقاضوں کے منافی ہے۔ دہشت گرد صرف وہی غیر شہری ہو سکتا ہے جو جنگی عزائم کا حامل ہو۔ محض کسی مشکوک فرد کو 'دشمن' قرار دینا، اس وضاحت کے بغیر کہ وہ دہشت گردی کا مرتکب ہوا ہے، انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ تعریف میں یہ جھول خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری ترمیم کے ذریعے دہشت گردی کے مجرموں کے لیے سزا اب ۱۰ سال سے بڑھا کر ۲۰ سال کر دی گئی ہے لیکن ان کی احتیاطی نظر بندی ایک خلافِ انصاف عمل ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو گنجائش دی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ۲۴ گھنٹے کی مدت اگر کم ہے تو ۷ یا ۱۰ دن کے اندر اندر ایک شخص پر الزام عائد کیا جائے یا اس کی آزادی کو بحال کیا جائے۔ دستور میں اس کی گنجائش موجود ہے لیکن اس قانون میں دستور کی دفعہ ۱۰ کے تحت Due process of law (ضروری قانونی عمل) کے باب میں جو رخصت دی گئی ہے، یہ اس سے بہت زیادہ ہے اور اس طرح اس کے انسانی آزادیوں کے لیے خطرہ ہونے اور سیاسی بنیادوں پر استعمال کیے جانے کے خدشات موجود ہیں۔

ایک اور معمولی ترمیم قانون کی اس شق میں بھی کی گئی ہے جس میں شبہ کی بنیاد پر

گولی چلانے کا اختیار پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والے افراد کو دیا گیا تھا اور جسے ہم نے اور حقوقِ انسانی کے تمام ہی علم برداروں نے، شدت سے تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ہمارے اصل اعتراض کا تو کوئی مداوا نہیں کیا گیا۔ بس یہ اضافہ کر دیا گیا ہے کہ ایسا حکم پولیس کا گریڈ ۱۵ یا اس سے اُوپر کا کوئی افسر دے سکے گا۔ ہماری نگاہ میں محض شبے کی بنیاد پر انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا صریح ظلم اور ریاستی دہشت گردی کی ایک بدترین شکل ہے۔ پولیس مقابلے کے نام پر یہ خونی کھیل شب و روز ہو رہا ہے۔ حال ہی میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں جو کچھ ہوا (۷ جولائی ۲۰۱۴ء) وہ سب کے سامنے ہے۔ گریڈ ۱۵ کی قید سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر یہ گریڈ ۱۵ کی قید بھی صرف پولیس کے لیے ہے۔ فوج اور دوسرے نیم فوجی ادارے اس سے مستثنیٰ ہیں۔

دوسری جانب ایسے اقدام کے سلسلے میں لازمی جوڈیشل ریویو کی بھی کوئی باقاعدہ گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ شکایت کی شکل میں In-house inquiry (شعبہ جاتی تحقیقات) کا ذکر ہے جو ایک Bluff (فریب دہی) اور لیپاپوتی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس شق پر ہمارا اعتراض موجود ہے اور یہ دستور، اصولِ قانون اور شریعت کے قواعد و ضوابط کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ایک اور ترمیم کے ذریعے اس قانون کی مدت دو سال کر دی گئی ہے جسے قانون کی زبان میں Sunset provision (یعنی ایسا معاہدہ جو میعاد کے خاتمے پر اگر تجدید نہ کریں تو خود بخود ختم ہو جائے) کہا جاتا ہے۔ لیکن دو سال قیامت لانے کے لیے کیا کم مدت ہے کہ اس تجدید پر اطمینان کا اظہار کیا جائے۔

ایکٹ پر اعتراضات

اپنی ترمیم شدہ شکل میں بھی اس قانون پر ہمارے موٹے موٹے اعتراضات یہ ہیں:

۱۔ اب بھی قانون میں دہشت گردی کی تعریف میں بہت سقم پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر یہ واضح دفعہ کہ اس شخص کو بھی دہشت گرد قرار دیا جاسکتا ہے جو دھمکی دیتا

ہے، اقدام کرتا ہے، یا اقدام کرنے کی کوشش کرتا ہے جو پاکستان کے دفاع، سلامتی اور استحکام کے خلاف ہو۔ یہ اتنی ڈھیلی ڈھالی تعریف ہے کہ اس کے تحت سرکار جسے چاہے دہشت گرد بنا سکتی ہے اور سیاسی اختلاف اور تنقید بھی ایک شخص کو اس لقب کا سزاوار بنا سکتی ہے جیسا کہ ملک میں ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے۔ پُر تشدد اقدام (Act of violence) پر قانون کی گرفت بجا، مگر محض انتظامیہ کی نگاہ میں جو بھی قول یا فعل سلامتی وغیرہ کے خلاف ہو، وہ بھی دہشت گردانہ اقدام بن جاتا ہے۔ یہ دستور، شریعت اور اصولِ قانون سے متصادم اور انسانی معاشرے اور بنیادی حقوق کے لیے ایک چیلنج ہی نہیں، فی الحقیقت ایک بے نیام تلوار ہے۔

۲۔ ترمیم شدہ قانون میں ایک نیا ظلم یہ کیا گیا ہے کہ اس کی دوسری فہرست میں جو جرائم ایک دوسرے سے مربوط ہیں، ان میں حکومت اپنی مرضی سے جب چاہے ترمیم و اضافہ کر سکتی ہے۔ یہ پارلیمنٹ کے اختیار پر ڈاکا زنی کے مترادف ہے۔ محض انتظامی حکم نامے سے فہرست میں اضافہ دستور اور اسلامی اصولِ عدل دونوں سے متصادم ہے اور سیاسی بنیادوں پر انتقام کا دروازہ کھولنا ہے۔

۳۔ احتیاطی نظر بندی کے باب میں ہمارے اعتراضات حسب سابق باقی ہیں اور ہم اس پہلو سے بھی ترمیم شدہ بل کو ناقابلِ قبول سمجھتے ہیں جو دستور کی دفعہ ۱۰ کی بھی خلاف ورزی ہے۔

۴۔ فرد اور گھر کی پوشیدگی اور خلوت پر دست درازی کا جو اختیار اس قانون میں دیا گیا ہے وہ بھی شریعت اور دستور دونوں کے خلاف ہے۔ وارنٹ کے بغیر تلاشی انسانی حقوق پر ایک وحشیانہ حملہ ہے اور کوئی مہذب معاشرہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ عدالتِ عظمیٰ نے بھی اپنے ایک مشہور فیصلے میں جو 'مقدمہ محرم علی بنام وفاق' پر مبنی ہے دستور کی دفعہ ۱۴ کے تحت ایسے اقدام کے جواز کو چیلنج کیا ہے اور غیر معمولی حالات میں جب جوڈیشل آرڈر ممکن نہ ہو تو لازمی قرار دیا ہے کہ ان

حالات کا تحریری طور پر ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے عدالتی اجازت اور وارنٹ کے بغیر ایسا اقدام کیا جارہا ہو۔

۵۔ اسی طرح بلا اشتعال پیشگی فائرنگ جو محض شبہے کی بنیاد پر کی جائے، اس کا کسی شکل میں بھی جواز ممکن نہیں۔ اس اقدام کو بھی سپریم کورٹ نے دستور کی دفعہ ۹ سے متصادم قرار دیا ہے۔ ہماری پولیس اور دوسرے ادارے اس سلسلے میں بڑا سیاہ ریکارڈ رکھتے ہیں اور ان کا اس طرح شبہے کی بنیاد پر عام انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا صریح ظلم اور ریاستی دہشت گردی کی بدترین مثال ہے۔

۶۔ وارنٹ کے بغیر گرفتاری کا حق بھی بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہے اور یہ بھی اس قانون میں حسب سابق موجود ہے۔

۷۔ اس قانون میں الزام کے ثبوت کے سلسلے میں دستور، شریعت اور اصولِ قانون کے اس مسلّمہ اصول کو کہ ثبوت دینا الزام لگانے والے کا فرض ہے اور ہر شخص معصوم ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت ہو جائے، اُلٹ دیا گیا ہے۔ اب الزام حکومت کے کارپرداز لگائیں گے اور معصومیت ثابت کرنا ملزم کی ذمہ داری ہو گی۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ طریق تفتیش ناقابلِ قبول ہے۔

۸۔ اس قانون میں لاپتہ افراد کے سلسلے میں ایک عظیم ناانصافی کا دروازہ کھولا گیا ہے، یعنی جو افراد سرکاری اداروں کی تحویل میں بلا قانونی جواز موجود ہیں ان کو بھی مؤثر بہ ماضی (With retrospective effect) زیر حراست تصور کیا جائے گا۔ یہ قانون کے مسلّمہ اصولوں کی نفی ہے اور اس کے ذریعے ایک غیر قانونی عمل کو قانونی جواز فراہم کرنے کے جرم کا ارتکاب کیا جارہا ہے اور اس پر قانون کا غلاف بھی چڑھایا جارہا ہے۔ اس طرح دستور کی دفعہ ۱۰ کی ماضی میں جو خلاف ورزیاں ہوتی رہی ہیں ان کو سند جواز دی جاسکتی ہے۔

دستور کی حدود میں نظر ثانی کی ضرورت

کم از کم یہ آٹھ پہلو ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ قانون ایک کالا قانون ہے۔ پارلیمنٹ نے اسے قانون کی شکل دے کر قوم کے سر شرم سے جھکا دیئے ہیں اور وہ دستور اور شریعت دونوں کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ عدالت عالیہ سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں سے بالا ہو کر دستور اور اصولِ شریعت کی روشنی میں اس قانون کا جائزہ لے گی اور اس کی ان تمام شقوں کو خلافِ دستور قرار دے گی جو بنیادی حقوق اور اصولِ انصاف کی ضد ہیں۔

ہم پارلیمنٹ کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس قانون پر نظر ثانی کرے اور قومی سلامتی اور دستور، شریعت اور انسانی حقوق کی حفاظت اور پاسداری دونوں میں مکمل توازن کے ساتھ قانون سازی کی ذمہ داری ادا کرے ورنہ وہ ان حدود کو پامال کرنے کی مجرم ہو گی جو دستور نے اس کے اختیارات کے استعمال کے لیے مقرر کیے ہیں۔ مقننہ ہو یا انتظامیہ یا عدالت، سب دستور کی تخلیق (Creatures) ہیں اور دستور کی دی ہوئی حدود کے اندر ہی وہ اختیارات کے استعمال کا حق رکھتے ہیں۔ وہ عوام اور اللہ دونوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔ انسان سے غلطی ہو سکتی ہے لیکن غلطی پر اصرار غلطی سے بھی بڑا جرم ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پارلیمنٹ کو اصلاح اور اس کالے قانون میں ضروری ترمیم کی توفیق سے نوازے تاکہ وہ اس ظلم کی تلافی کر سکیں جس کا ارتکاب انھوں نے اس قانون کو منظور کر کے کیا ہے۔

(عالمی ترجمان القرآن، نومبر ۲۰۱۳ء، اگست ۲۰۱۴ء)

امریکی ڈرون حملے اور سپلائی لائن کی بندش

ڈرون حملے پہلے دن سے غلط اور پاکستان کی آزادی، خود مختاری اور سالمیت کے لیے ایک چیلنج تھے، جنھیں کسی بھی شکل میں اور کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کیا جانا چاہیے تھا اور نہیں کیا جاسکتا۔ بد قسمتی سے سابقہ حکومتوں نے اس بارے میں مجرمانہ غفلت اور شاطرانہ مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور ملک و ملت کی آزادی اور عزت دونوں کو بُری طرح پامال کیا۔ توقع تھی کہ ۱۱ مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات کے بعد قائم ہونے والی حکومت ماضی کی روش کو یکسر تبدیل کرے گی اور عوام سے جس بنیاد پر اس نے مینڈیٹ حاصل کیا ہے، اس کی روشنی میں ایک خود مختار اور آزاد ریاست کے مفادات کے مطابق خارجہ پالیسی اور دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ سے نکلنے کا راستہ اختیار کرے گی۔ لیکن ان چھے مہینوں میں مرکزی حکومت نے ویسے تو ہر میدان میں قوم کو مایوس کیا ہے، تاہم جس سلسلے میں وہ سب سے زیادہ ناکام رہی ہے، وہ امریکہ سے تعلقات کو از سرِ نو مرتب کرنا اور دہشت گردی کی امریکی جنگ سے نکلنے کے لیے قومی جذبات اور سیاسی اتفاق رائے کے مطابق مؤثر اقدام ہے۔

امریکہ نے اپنی جارحانہ پالیسیوں کو نہ صرف جاری رکھا ہے، بلکہ ان کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجے میں مذاکرات کے سیاسی عمل کے ذریعے دہشت گردی کے خاتمے کی کوششوں کو وہ مسدود کر رہا ہے اور پاکستان کو جنگ کی آگ میں دھکیلنے کا کھیل کھیل رہا ہے۔

یکم نومبر ۲۰۱۳ء کو فاٹا میں میر ان شاہ کے مقام پر ڈرون حملہ مذاکراتی عمل کو اس کے

آغاز سے پہلے ہی تباہ کرنے کی کھلی کھلی کوشش ہے، اور پھر ۲۰ نومبر کو خیبر پختون خوا کے آباد علاقے ہنگو میں ایک دینی تعلیمی ادارے پر حملہ اس جنگ کو وسعت دینے کی ایک ناپاک اور شر انگیز جسارت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو حالات میں جوہری تبدیلی کا ذریعہ بن گئی ہے۔ قوم کے لیے اپنی آزادی، خود مختاری اور عزت کی حفاظت کے لیے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ اپنی آزادی، مفادات اور عزت کے تحفظ کے لیے اُٹھ کھڑی ہو اور پالیسی تبدیل کرنے کے لیے حکومت پر مؤثر سیاسی دباؤ ڈالے۔ امریکی اور نیٹو افواج کے لیے پاکستان کی سرزمین کے راستے رسد جانے کو روکنا خود مطلوب نہیں بلکہ اصل ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ایک مؤثر، پُرامن اور قابلِ عمل ذریعہ ہے، تاکہ نہ صرف یہ کہ ہماری ملکی سرحدات کی خلاف ورزیوں کو روکنے کے لیے ملکی اور عالمی سطح پر مؤثر اقدامات کیے جاسکیں، بلکہ امریکہ کی اس جنگ سے ہم نکل سکیں اور توجہ کا مرکز، مسائل کا سیاسی حل بن سکے۔ اس کے نتیجے میں راہ کی تمام رکاوٹوں کو دُور کیا جاسکے گا اور ملک میں امن و امان کی وہ کیفیت پیدا کی جاسکے گی، جس میں عوام سُکھ کا سانس لے سکیں، معیشت رُوبہ ترقی ہوسکے اور ۱۲ سال سے جس آگ میں ملک جل رہا ہے اس سے نجات پائی جاسکے۔

اصل ہدف امریکی جنگ سے نکلنا، اس جنگ کو پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پورے علاقے میں ختم کرنے کی راہ ہموار کرنا، ڈرون حملوں کو فوری طور پر بند کروانا اور مذاکرات کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ یہ تمام اُمور اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ ان سے الگ الگ پنجہ آزما نہیں ہوا جاسکتا۔ اس لیے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اور قوم میں بھی اس مصلحت کے بارے میں مناسب اور مؤثر انداز میں تفہیم کا اہتمام کرنا چاہیے کہ سپلائی لائن کو روکنے کی کوشش ایک ذریعہ ہے، تاکہ ایک طرف عوام کو متحرک کیا جاسکے، تو دوسری طرف مرکزی حکومت اور عالمی رائے عامہ کو ڈرون حملوں کو رُکوانے، دہشت گردی کے خلاف اس ۱۲ سالہ جنگ کی ناکامی کو الم نشرح کرنے، اور مسئلے کے حل کے لیے متبادل حکمت عملی پر فی الفور اور سرگرمی سے کوشش کو ممکن بنایا جائے۔

ڈرون حملے خود اپنی جگہ ایک ظلم، ایک جرم اور تباہی کا سبب ہیں اور اس کے ساتھ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے بنیادی حکمت عملی کی راہ کی بڑی رکاوٹ ہیں۔ بظاہر امریکہ کو یہ ایک آسان راستہ نظر آیا ہے کہ اپنی فوجوں کو جانی نقصان سے بچانے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانوں کا قتل عام کرے اور سمجھے کہ اس طرح دہشت گردی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ظلم کے نتیجے میں دہشت گردی میں اضافہ ہو رہا ہے اور بلانام کے ایک دہشت گرد کی ہلاکت کے نتیجے میں دسیوں نئے دہشت گرد پیدا ہو رہے ہیں، اور پوری پوری آبادیاں اپنے پیاروں سے محروم ہو کر غم و غصے اور ہیجان میں مبتلا ہی نہیں ہو رہیں بلکہ نفرت اور انتقام کی آگ میں بھی جل رہی ہیں۔ اس طرح یہ حملے بگاڑ اور خطرات میں اضافے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

ایک امریکی دانش ور ڈیوڈ سوان سن (David Swanson) نے کاؤنٹر پنچ کے ۲۶ نومبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں افغانستان میں امریکی فوجوں کو مزید روکے رکھنے کی پالیسی پر سخت تنقید کی ہے اور اس جنگ سے جو کچھ حاصل ہوا ہے، اسے ایک جملے میں بڑی خوب صورتی سے بیان کر دیا ہے، یعنی: ہم افغانستان کی جنگ پر ہر گھنٹے ۱۰ ملین [یعنی ایک کروڑ] ڈالر خرچ کر رہے ہیں مگر ہمیں جو کچھ حاصل ہوا وہ یہ ہے کہ ملک میں ہم زیادہ غیر محفوظ ہیں اور دنیا بھر میں ہم سے نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔

'دہشت گردی کے خاتمے' کے نام پر اس جنگ سے امریکہ کے اعلان شدہ مقاصد یہ تھے کہ: امریکہ کو ہم محفوظ بنا رہے ہیں اور دنیا کے دل و دماغ جیتنے کی سعی کر رہے ہیں، مگر امریکی مقتدرہ کو ان دونوں مقاصد میں ناکامی ہوئی ہے۔ یہ تو اعلان شدہ مقاصد تھے۔ اصل مقاصد تو دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنا تھا (Global hegemony) اور اس کے دن بھی اب گنے جا رہے ہیں۔

امریکہ کو ویت نام اور عراق کی طرح افغانستان میں بھی ناکامی کا سامنا ہے اور اپنی آبرو بچانے کے راستے تلاش کر رہا ہے۔ امریکی عوام کی اکثریت اس جنگ کو ایک ناکام مہم

جوئی قرار دے رہی ہے اور اس سے نجات کا مطالبہ کر رہی ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں ماسوا، اسرائیل اور بھارت، امریکہ کی مقبولیت کا گراف اتنا گر چکا ہے کہ ۵۰ سے ۹۰ فی صد لوگ اس سے متنفر ہیں۔ پاکستان میں ۹۳ فی صد اسے دوست نہیں سمجھتے اور اب تو خود افغانستان کے وہ عناصر جن پر امریکہ کو تکیہ تھا، اس جنگ کی ناکامی اور امریکہ سے نجات کی بات کر رہے ہیں۔

۲۳ نومبر ۲۰۱۳ء کابل میں امریکہ کے ساتھ دوطرفہ معاہدے کے بارے میں جو لویہ جرگہ منعقد ہوا ہے، اس میں حامد کرزئی کی تقریر کے دوران ایک خاتون شریکِ جرگہ نے بلند آواز سے کہا: ''امریکی افواج نے بہت زیادہ افغان خون بہایا ہے، یہ اب رُکنا چاہیے''، جس نے تمام شرکا کو ششدر کر دیا اور عالمی میڈیا کو اس فطری ردعمل کا نوٹس لینا پڑا (الجزیرہ، انگلش، ۲۵ نومبر ۲۰۱۳ء)۔ حامد کرزئی اور امریکہ میں اعتماد کا فقدان ہے جس کا اظہار کرزئی نے جرگہ سے اپنے خطاب میں ان الفاظ میں کیا: ''مجھے امریکہ پر زیادہ اعتماد نہیں ہے۔ میں ان پر اعتبار نہیں کرتا، وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے''۔ اس موقع پر، جب کہ امریکی سفیر جیمز کننگھم (James Cunningham) بھی سامنے موجود تھا، حامد کرزئی نے جو کچھ کہا ہے وہ اہم ہے اور اس میں پاکستان کے ان دانشوروں اور خصوصیت سے لبرل لیفٹ لابیز کے بلند آہنگ سورماؤں کے لیے بڑا سبق ہے جو امریکہ کی اس جنگ کو اپنی جنگ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ افغان صدر نے کہا: ''اگر ہم نے جنگ کا آغاز کیا ہوتا تو ہم ہی اسے ختم کر سکتے تھے۔ اگر ہم نے آغاز نہیں کیا تو ہم اسے ختم نہیں کر سکتے۔ اس جنگ کا آغاز ہمارے علاوہ کسی اور نے کیا''۔

اسی طرح حامد کرزئی نے چند دن پہلے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے جنگ کی ناکامی کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے جسے امریکہ نے بڑی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ افغان صدر کا ارشاد ہے: ''سلامتی کے محاذ پر نیٹو کی تمام مشقیں بہت زیادہ تکالیف اور جانیں جانے کی وجہ بنی ہیں''۔ اور پھر نہایت مایوسی سے اعتراف کیا کہ: ''اور کچھ حاصل نہیں ہوا، اس لیے

کہ ملک محفوظ نہیں ہے"۔

اس تباہ کن جنگ کا آغاز بھی امریکہ نے کیا ہے اور اسے ختم بھی اسے ہی کرنا ہو گا۔ افغانستان اس کی اصل آماج گاہ ہے لیکن پاکستان کو بھی اس جنگ میں زبردستی شریک کر لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی اس جنگ کے اخراجات کے ایک حصے کا بل بھی امریکہ ہی ادا کر رہا ہے جسے پاکستان کے باب میں کولیشن سپورٹ فنڈ کا نام دیا گیا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ان تاریخی حقائق اور اُجرت کی جزوی وصولی، جو کبھی کبھی حقارت آمیز تک ہو جاتی ہے، کے باوجود ملک کی سیاسی اور عسکری قیادت کا ایک حصہ اسے اپنی جنگ کے طور پر پیش کرنے لگا ہے اور اب تو انتہا یہ ہے کہ یہ لابی ڈرون حملوں پر ظاہری تشویش کا اظہار کرنے کے بعد ان کی افادیت، ضرورت اور ناگزیریت تک کی باتیں کر رہی ہے، اور امریکہ اور نیٹو افواج کے لیے رسد کو بھی اس لیے ضروری قرار دے رہی ہے کہ اس کا تعلق بین الاقوامی معاہدے سے ہے اور اس سے امریکی فوجوں کی افغانستان سے واپسی میں مدد ملے گی۔

ضرورت ہے کہ ان تمام اُمور پر کھل کر بات کی جائے اور پاکستان کی آزادی اور سلامتی کی حفاظت اور اس کے اسٹرے ٹیجک مفادات کے تحفظ کے لیے واضح پالیسی بنائی جائے، اور دنیا کی تمام سیاسی قوتوں سے صرف قومی مفاد اور وقار کے مطابق معاملہ کیا جائے۔ اس وقت ڈرون حملوں کو رُکوانا اور اس کے لیے بشمول سپلائی لائن کو بند کرنے کے مختلف Leverages استعمال کرنا قوم و ملت کی اہم ترین ضرورت بن گیا ہے۔ لیکن ہمیں اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ ڈرون حملے امریکی جارحیت اور مداخلت کا صرف عنوان ہیں اصل ایشو 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے نکلنا اور امریکہ سے تعلقات کی خیالی نہیں بلکہ حقیقی بنیادوں پر تشکیل نو کرنا ہے۔ اس کے لیے ڈرون حملوں کا رُکنا اولین ضروری قدم ہے اور سپلائی لائن روکنے کی کوشش کا مقصد حکومت کی پالیسی اور کارروائی میں وہ تبدیلیاں لانا ہے جو اس مقصد کے حصول کو ممکن بنا سکے۔ طالبان سے مذاکرات کا مقصد بھی دہشت گردی اور 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' دونوں ختم کرانے اور ملک میں امن اور سلامتی کی فضا پیدا

کرنے کی کوششوں کے باب میں حکمت عملی کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری پاکستانی قوم مذاکرات چاہتی ہے اور تمام سیاسی جماعتوں نے اسی قومی خواہش کو ۹ ستمبر کی 'کل جماعتی کانفرنس' کی قرارداد کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو امریکہ نہیں چاہتا اور امن اور دہشت گردی کے خاتمے کے لیے وہ ہر اس کوشش کو ناکام بنانے کے لیے سرگرم ہے جو اس کے ایجنڈے کے مطابق نہیں۔

بنیادی حقائق

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک بار اُن بنیادوں کو واضح طور پر بیان کر دیا جائے جن کا اِدراک صحیح حکمت عملی کے بنانے کے لیے ضروری ہے:

۱۔ پاکستان اور افغانستان دینی، سیاسی، تہذیبی، قبائلی، خاندانی اور معاشی رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ وہ صرف جغرافیائی طور پر ہی ہمسایہ نہیں۔ یہ رشتہ ہمہ جہتی اور تاریخی اعتبار سے صدیوں کے تعلق کی بنیاد پر استوار ہے اور اپنے بہت سے اختلافات کے باوجود ہر بُرے وقت میں یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے پشتی بان اور مددگار رہے ہیں۔ گذشتہ ۱۲ برسوں میں اس رشتے میں جو دراڑیں پڑی ہیں وہ امریکہ کی افغان جنگ کی وجہ سے ہیں۔ دونوں ممالک کی قیادت اور عوام کا فرض ہے کہ اپنی اپنی غلطیوں کا احساس اور اعتراف کرتے ہوئے دوستی، بھائی چارہ اور باہمی تعاون کے اصل رشتوں کو استوار کریں۔ ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت سے مکمل گریز کریں اور سیاسی اُمور کو سیاسی مذاکرات کے ذریعے طے کریں۔ ان ۱۲ برسوں میں امریکہ کا کردار بڑا منفی رہا ہے جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کو بڑا عظیم نقصان ہوا ہے جس کی تلافی اب ہمارا ہدف ہونا چاہیے۔ اس کے لیے افغانستان سے امریکی افواج کا مکمل انخلا ضروری ہے۔ اگر امریکی افواج ۱۰ یا ۱۲ ہزار کی تعداد میں مع نوفوجی اور ہوائی اڈوں کے وہاں رہتی ہیں تو نہ افغانستان میں یہ جنگ ختم ہوگی

اور نہ پاکستان اس آگ کی لپٹوں سے بچ سکے گا۔

۲۔ افغانستان میں ضروری ہے کہ قومی مفاہمت کی بنیاد پر افغانستان کی تمام سیاسی اور دینی قوتیں مل کر کسی بیرونی مداخلت کے بغیر، اپنے معاملات کو طے کریں، اور ملک کو نہ صرف خانہ جنگی کے خطرات سے بچائیں بلکہ قومی تعمیر نو اور ترقی کے ایک نئے دور کے لیے سب مل کر سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ اس سلسلے میں مُلّا عمر نے عید الاضحیٰ کے موقعے پر جو پیغام دیا ہے وہ بڑا اہم ہے کہ اس میں امریکی اور نیٹو افواج کے مکمل انخلا کے ساتھ تین اہم باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی:

الف۔ افغانستان میں ایک ایسا سیاسی انتظام جس میں وہاں موجود تمام افغان قوتیں اور عناصر شریک ہوں، یعنی سب کو ساتھ لے کر چلنے کا نقطۂ نظر۔

ب۔ تعلیم اور دوسرے اُمور کے بارے میں وسعت نظر کا عندیہ۔

ج۔ معصوم انسانوں کو ہلاکت کا ہدف بنانے سے مکمل احتراز۔

کچھ دوسرے بیان بھی اپنے اندر نئی اور کھلی سوچ کا پیغام رکھتے ہیں۔ یہ مثبت اشارے ہیں۔ پاکستان اور دوسرے حقیقی ہمسایہ ممالک خصوصیت سے ایران کی کوشش ہونی چاہیے کہ افغان مسئلے کا افغان حل نکالا جائے اور سب مل کر ملک کے استحکام کے لیے کوشش کریں۔ پاکستان کا مفاد اس میں ہے کہ افغانستان میں امن ہو اور وہ بیرونی عناصر خصوصیت سے امریکہ اور بھارت کے کھیل کا حصہ نہ بنے۔ ہمیں افغانستان کے معاملات کو افغان بھائیوں پر مکمل طور پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ ایک طرف ہمارے مشترک مفادات کا حصول ہو سکے تو دوسری طرف دونوں کے اپنے اپنے مفادات کا احترام ہو۔ یہ تعلق سچائی اور شفافیت پر مبنی ہونا چاہیے، اسی میں خیر ہے۔

۳۔ پاکستان کے لیے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ امریکہ کی اس جنگ سے ایک متعین نظام الاوقات کے مطابق اپنے تعلق کو ختم کرے، اور اس جنگ میں شراکت

اور امریکہ سے معمول کے سیاسی، سفارتی اور معاشی تعلقات جو دو الگ الگ ایشوز ہیں، ان پر الگ الگ معاملہ کرے۔ 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے نکلنے اور اس میں امریکہ کے شریکِ کار نہ رہنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم امریکہ سے ٹکراؤ یا جنگ چاہتے ہیں، البتہ یہ ایک حقیقت ہے اور امریکہ کے ۶۶ سالہ تعلقات کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ امریکہ سے ہماری اسٹرے ٹیجک پارٹنر شپ نہ کبھی تھی اور نہ ہوسکتی ہے۔ یہ اس لیے کہ زمینی حقائق اس کے لیے ساز گار نہیں۔ جہاں تک عمومی دوستی کا تعلق ہے، جسے سفارتکاری کی اصطلاح میں Transactional relations کہا جاتا ہے وہ دونوں کے مفاد میں ہیں اور ماضی میں ہمارے حقیقی تعلقات اس سطح سے کبھی بھی بلند نہیں ہوسکے۔ اس لیے زمینی حقائق کی روشنی میں تعلقات کو معروف دوستی اور مشترک مفادات کے باب میں تعاون کی بنیاد پر از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک شفاف انداز میں اس جنگ سے ہم نکلیں اور اگر ہمیں نکلنے نہ دیا جائے تو پھر اپنے مفادات کی روشنی میں مناسب اقدام کریں۔

اس کے لیے حکومت کو کیا کرنا چاہیے وہ ہم ضروری وضاحت کے ساتھ قوم اور حکومت اور اس کے تمام اداروں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان اُمور پر کھل کر دلیل کے ساتھ بات ہونی چاہیے۔ ایک دوسرے کو بلیک میل کرنے کی مذموم کوشش سے مکمل احتراز کیا جائے، جو بدقسمتی سے اس وقت کی جارہی ہے اور اس کا خصوصی نشانہ جماعت اسلامی پاکستان اور تحریک انصاف ہیں۔ یہ روش نہایت نقصان دہ ہے۔ ہم دلیل سے بات کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں اور دلیل سے قائل کرنے اور قائل ہونے کو صحیح راستہ سمجھتے ہیں لیکن غیر متعلقہ بحثوں کو اُٹھا کر ایک اصولی تحریک کو نشانہ بنانے کی کوشش نہ ماضی میں کامیاب ہوئی ہے اور نہ آج ہوسکتی ہے۔ جماعت اسلامی اور اس کی قیادت نے مختلف اَدوار میں ایسے حملوں کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور یہی توقع ہم تحریکِ انصاف اور دوسری تعمیری

قوتوں سے بھی رکھتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے بڑی سچی بات کہی تھی کہ برسرِ اقتدار عناصر یہ نہ سمجھیں کہ اصولی جماعتوں کو دھونس، دھمکیوں اور غلط بیانیوں سے مغلوب کیا جاسکتا ہے، بلکہ ان کی حیثیت لوہے کے چنوں کی سی ہے جن کو چبانے کی کوشش کرنے والے کے دانت ٹوٹ تو سکتے ہیں مگر ان لوہے کے چنوں کو چبایا نہیں جاسکتا.... ان شاء اللہ۔

واضح رہے کہ عوام احتجاج اور دھرنوں پر اس لیے مجبور ہوتے ہیں کہ حکومت اور ذمہ دار افراد اور ادارے معروف سیاسی راستوں کو عملاً غیر مؤثر بنادیتے ہیں اور سیاسی معاملات کے سیاسی حل سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو ایسے معاملات میں بھی مداخلت کرنا پڑتی ہے جو بالعموم ان کے دائرے میں داخل نہیں، لیکن دستور میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کے محافظ کی حیثیت سے جب متعلقہ ادارے دادرسی میں ناکام رہتے ہیں تو پھر عدالتوں کو اقدام کرنا پڑتا ہے۔

ڈرون حملوں کی مخالفت کے اسباب

ڈرون حملوں کا مسئلہ کسی ایک علاقے یا کسی ایک جماعت اور گروہ کا مسئلہ نہیں۔ یہ پاکستان کی پوری قوم اور ملک کی آزادی، خودمختاری، سلامتی اور عزت و وقار کا مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق اقوام متحدہ کے چارٹر، بین الاقوامی قانون اور پاکستان کے دستور سے ہے جن کی ان کے ذریعے دھجیاں بکھیری جارہی ہیں۔ یہ ایک انسانی مسئلہ ہے اور بین الاقوامی انسانی قانون (International Humanitarian Law) سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ یہ ملک میں دہشت گردی کے مسئلے سے جڑا ہوا ہے اور پورے پورے علاقے کے امن و امان اور لاکھوں انسانوں کی زندگی کے سُکھ اور چین سے اس کا تعلق ہے۔ لیکن حکومت اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔ ڈرون حملے امریکی استعمار کا ایک شرم ناک ہتھیار ہیں جسے انتقام اور شبہے کی بنیاد پر انسانوں کے قتل کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ اب عالمی سطح پر اقوام متحدہ کے ایوانوں میں، یورپین پارلیمنٹ میں اور خود امریکہ میں صرف

دانش وروں اور قانون سے متعلق حلقوں ہی میں نہیں خود امریکی کانگرس کی کمیٹیوں کی سطح پر بھی اس پر تنقید ہو رہی ہے لیکن ہماری حکومت کا رویہ نا قابلِ فہم ہی نہیں قابلِ مذمت ہے۔

ڈرون حملے کم از کم مندرجہ ذیل بنیادوں پر نا قابلِ برداشت ہیں:

۱۔ یہ پاکستان کی علاقائی حاکمیت اور خود مختاری پر حملہ ہیں۔ پاکستان کسی بین الاقوامی وارزون کا حصہ نہیں اور اس کی فضائی اور زمینی سرحدات کو جو بھی پامال کرے اور بے دردی سے پامال کرتا رہے وہ ہمارے خلاف جنگی اقدام کا مرتکب ہو رہا ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ دستور پاکستان کی سرزمین، اس کی سرحدات اور پاکستان کے شہریوں کے جان ومال اور عزت کی محافظت کی ضمانت دیتا ہے۔ امریکہ اس کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور پاکستان اور اس کے ذمہ دار ادارے پاکستان کے دستور، اس کی سرحدات، اس کی آزادی، حاکمیت اور خود مختاری کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

۲۔ امریکہ کے یہ اقدام اقوام متحدہ کے چارٹر، بین الاقوامی قانون، بین الاقوامی انسانی قانون، اور خود امریکہ کے دستور کی خلاف ورزی ہے۔ سلامتی کونسل نے امریکہ کو پاکستان کی سرزمین پر کارروائی کرنے کا کوئی اختیار نہیں دیا، حتیٰ کہ امریکی کانگرس میں بھی یہ سوال اُٹھا دیا گیا ہے کہ کانگرس تک سے خفیہ رکھ کر امریکی سی آئی اے اور انتظامیہ جو اقدام کر رہی ہے وہ امریکی دستور کے خلاف ہے۔

۳۔ عالمی طور پر مسلّمہ تصورِ انصاف اور قانونی پراسس کی کھلی کھلی خلاف ورزی کی جا رہی ہے جس نے پورے فوجداری نظام عدل (Criminal justice) کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ ماورائے عدالت قتل اور ہدفی (Targeted) قتل خواہ افراد کریں یا حکومتیں، جرم ہیں اور اگر ان کا ارتکاب بین الاقوامی سطح پر کیا جائے تو یہ جنگی جرائم کے زمرے میں آتے ہیں، جیسا کہ خود اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے رپورٹر

(Rapporteur) نے بار بار کہا ہے اور اکتوبر ۲۰۱۳ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش کی جانے والی اپنی رپورٹ میں صاف اور سخت الفاظ میں اس کا اعادہ کیا ہے۔

۴۔ غیر متحارب شہریوں بشمول خواتین، بچے اور بوڑھے انسانوں کا قتل، کسی عدالتی عمل کے بغیر، اگر بڑے پیمانے پر ہو تو نسل کشی شمار کیا جاتا ہے جو انسانیت کے خلاف ایک عظیم جرم ہے۔ امریکہ کی اس جنگ میں ڈرون کے بے محابا استعمال سے ایک امریکی تحقیقی ادارے کی رپورٹ کے مطابق ہلاک کیے جانے والوں میں متعین طور پر دہشت گردوں اور ان کے رہنماؤں کی تعداد بمشکل ۳فی صد ہے، جب کہ ۹۷ فیصد کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں کہ ان کا کوئی تعلق کسی بھی درجے میں کسی دہشت گرد گروپ سے تھا۔ امریکی حکومت نے اپنے ناجائز اقدام پر پردہ ڈالنے کے لیے متحارب کی ایک نئی تعریف وضع کی ہے، یعنی متحارب وہ نہیں جو عملاً کسی جنگ یا دہشت گردی میں ملوث ہو بلکہ اس علاقے میں جسے امریکہ جنگ کا علاقہ سمجھتا ہے، ہر وہ مرد جو ۱۶ سے ۶۰ سال کی عمر میں ہو دہشت گرد تصور کیا جائے گا۔ اس تعریف کو دنیا میں کسی نے قبول نہیں کیا اور نہ اسے قبول ہی کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس کا دائرہ اس طرح وسیع کیا جائے تو پھر دنیا کا کوئی بھی مرد کسی نہ کسی کے ڈرون کا نشانہ بننے کا مستحق ٹھیرتا ہے۔ امریکہ کے اپنے تحقیقی اداروں کی اب چھ سے زیادہ رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں اور جو مبنی ہیں ان ٹوٹی پھوٹی معلومات پر جو میسر ہیں، اور ان کا حاصل یہ ہے کہ ڈرون حملوں سے ہلاک ہونے والے تین سے چار ہزار افراد میں سے ۴۰۰ سے ۹۰۰ تک کو معلوم طور پر سویلین قرار دیا جارہا ہے اور ان میں عورتوں اور بچوں کی تعداد ۳۰۰ سے زیادہ بتائی جارہی ہے۔

۵۔ پھر ایک اور انسانی پہلو یہ ہے کہ ڈرون صرف لوگوں کو متعین طور پر ہی نشانہ نہیں بناتے بلکہ پوری پوری آبادیوں پر گھنٹوں پرواز کرنے اور فضا کو اپنی مکروہ آواز سے

پراگندہ کرتے ہیں اور اس طرح ان علاقوں میں بسنے والے تمام لوگوں پر مسلسل خوف کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں، اور تمام آبادی میں خصوصیت سے بچوں اور عورتوں میں ذہنی امراض کا سبب بن رہے ہیں۔ اس طرح یہ ایک اور انداز میں نسل کشی کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ گویا عالمی قانون، ملک کا دستور، بین الاقوامی انسانی قانون، اور انسانی معاشرے کے بنیادی آداب، ہر پہلو سے ڈرون حملے ناجائز اور اس ملک اور اس کے باسیوں کے خلاف اقدامِ جنگ اور کھلے کھلے ظلم کا ارتکاب ہیں۔ ان کے لیے جواز فراہم کرنا ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔

۶۔ یکم نومبر کو جو ڈرون حملہ ہوا ہے اس نے ایک نئے پہلو کا اضافہ کر دیا ہے، یعنی امن کے مذاکرات اور سیاسی عمل کو سبوتاژ کرنے کی مذموم سعی۔

فوری اقدامات

ان چھ وجوہ سے پاکستانی قوم اور حکومت کے لیے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ ڈرون حملوں کے فی الفور بند کیے جانے کا مطالبہ کرے اور اس سلسلے میں کم از کم مندرجہ ذیل اقدام کرے:

۱۔ حکومت کی طرف سے ان حملوں کے ناجائز اور ناقابلِ قبول ہونے کا اسٹیٹ پالیسی کے طور پر برملا اعلان اور امریکہ سے مطالبہ کہ انھیں فی الفور بند کیا جائے ورنہ حکومت اور قوم ان کا توڑ کرنے کے لیے ہر ضروری اقدام کرے گی۔ امریکی حکومت کو واضح الٹی میٹم تاکہ اس باب میں کوئی عذر باقی نہ رہے۔ ماضی میں اگر کسی نے کوئی اشارہ دیا بھی ہے تو اس کی تنسیخ اور واضح، حالانکہ بین الاقوامی قانون کا یہ اصول بھی مسلّمہ ہے کہ انفرادی حیثیت سے کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری فرد کا کوئی قول ایسے معاملات میں جہاں معاملہ ملک کے دستور اور قانون، حکومت کے ضابطۂ کار اور بین الاقوامی قانون بشمول بین الاقوامی قانون بسلسلہ انسانی حقوق

کا ہو، کبھی معتبر نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں وزیراعظم صاحب کے واشنگٹن کے دورے کے موقعے پر امریکہ کے اداروں نے پاکستان کے سیاسی اور عسکری ذمہ داروں کے ملوث ہونے کے بارے میں جو دستاویزات شائع کی ہیں ان کے قانونی طور پر ناقابلِ قبول ہونے کا اظہار اقوام متحدہ میں پیش کی جانے والی Christof Heyns Report سے بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈان میں ۱۹؍ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو شائع ہونے والی اس رپورٹ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

پاکستان کا واضح حوالہ دیتے ہوئے ہینز کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بین الاقوامی انسانی حقوق کے قانون کے مطابق: فوجی یا خفیہ افسران کی اجازت امریکہ کے کسی بیرونی ملک پر ڈرون حملے کرنے کا قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے کافی نہیں۔

ہینز کی رپورٹ جس میں دنیا میں مسلح تنازعات میں ڈرون کے استعمال کی قانونی شرائط بیان کی گئی ہیں، کے مطابق: کسی ریاست کی اعلیٰ ترین سرکاری مقتدرہ ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ طاقت کے استعمال کی اجازت دے۔ یہ کافی نہیں ہے کہ علاقائی اتھارٹی یا کچھ خاص ایجنسیوں سے یا حکومت کے شعبوں سے کوئی تائید حاصل کر لی جائے۔

ماضی میں جو ہوا سو ہوا لیکن اب حکومت کو صاف الفاظ میں ڈرون حملوں کے بند کیے جانے کا مطالبہ کرنا چاہیے اور پھر امریکہ کو عالمی عدالت اور اقوام متحدہ کے کٹہرے میں لانے کے لیے مؤثر اقدام کرنے چاہییں۔ رپورٹ میں اس سلسلے میں بھی واضح رہنمائی موجود ہے: ''طاقت استعمال کرنے کی اجازت جس لمحے واپس لی جائے تو جو ریاست ڈرون حملے کر رہی ہے بین الاقوامی قانون اس کو پابند کرتا ہے کہ وہ اس لمحے کے بعد مزید کسی حملے سے احتراز کرے''۔ رپورٹ مزید کہتی ہے: ''ریاستیں اپنی مملکت میں بین الاقوامی حقوق، انسانی قانون اور انسان دوست قانون کی کسی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دے سکتی''۔

۲۔ دوسرا اہم اقدام یہ ہے کہ اگر امریکہ ڈرون حملے نہیں روکتا تو سرکاری طور پر سپلائی لائن فی الفور بند کر دینی چاہیے اور اس سلسلے میں جو بھی معاہدہ ہوا ہے، جو خود ظلم اور جبر پر مبنی ہے اسے ختم کیا جائے۔ واضح رہے کہ وسط ایشیا سے لے جانے والی سپلائز پر امریکہ ۱۷ہزار ۵سو ڈالر فی ٹرک خرچ کر رہا ہے، جب کہ پاکستان کو صرف ۲۵۰ڈالر فی ٹرک دیا جاتا ہے۔ یہ اطلاعات بھی ہیں کہ اس سے کم از کم پانچ گنا زیادہ 'بھتہ' ہر ٹرک پر خود طالبان کو دیا جاتا ہے۔ ٹرکوں کی اس آمدورفت سے پاکستان کی سڑکوں اور انفراسٹرکچر کو جو نقصان گذشتہ ۱۲سال سے ہوا ہے اس کے بارے میں محتاط ترین سرکاری اندازہ یہ ہے کہ ہمیں ۱۰۰ بلین روپے سے زیادہ کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس راہ داری کی وجہ سے اگر ایک طرف کرپشن کا طوفان آیا ہے تو دوسری طرف اسمگلنگ اور خود اسلحے کی اسمگلنگ کا بازار گرم ہوا ہے اور ۱۹ہزار ٹرکوں کے غائب ہو جانے کا معمہ تو آج تک سپریم کورٹ کے سامنے ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر ہم یہ پابندی لگائیں تو اس سے دوسرے ممالک سے ہمارے تعلقات خراب ہوں گے، حالانکہ یہ ایک بے معنی واہمہ ہے۔ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے معاہدہ کرنے اور ختم کرنے کا ہمیں اختیار ہے اور دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ پابندیاں بھی لگائی جاتی ہیں، Tariff کے ہتھیار کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ اب معروف طریقے ہیں اور ان سے کوئی قیامت برپا نہیں ہوتی۔

اسی طرح اس بات میں بھی کوئی صداقت نہیں کہ اس وقت پابندی سے امریکی افواج کے انخلا پر اس کا اثر پڑے گا۔ ابھی تو سپلائز افغانستان جا رہی ہیں، اصل واپسی تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی، نیز واپسی کا انتظام ہماری نہیں امریکہ کی ذمہ داری اور ضرورت ہے۔ اگر وہ ہماری شرائط پر ہماری سہولتیں استعمال نہیں کرنا چاہتا تو شوق سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ ہمیں اس کے لیے پریشان ہونے کیا ضرورت

ہے۔ ڈرون کا معاملہ ہو یا راہ داری کا معاملہ، ہمارے لیے ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اصل پیمانہ ہماری اپنی آزادی اور حاکمیت اور قومی مفادات کا ہے، اور اگر ہم اپنے قومی مفادات کو دوسروں کے تابع کر دیتے ہیں تو یہ آزادی کا نہیں غلامی کا راستہ ہے۔ ہم ہی نہیں دوسرے بھی اس کا احساس رکھتے ہیں۔ مثلاً خود بارک اوباما کے ایک سابق مشیر مائیکل بوئیل (Michael Boyle) اپنے ایک حالیہ مضمون میں اعتراف کرتا ہے کہ: پاکستانی علاقے میں ڈرون حملے حکومت امریکہ کے سامنے جرنیلوں کی بے بسی اور تابع داری کی نہایت طاقت ور علامت ہیں۔ (بحوالہ الجزیرہ، انگلش، ۱۱ نومبر ۲۰۱۳ء)

اب یہ فیصلہ ہمارے ہاتھوں میں ہے کہ ہم آزادی کا راستہ اختیار کرتے ہیں یا غلامی اور بے چارگی کا!

۳۔ تیسری بنیادی چیز یہ ہے کہ ملک میں امریکہ کے جاسوسی نظام پر کاری ضرب لگائی جائے۔ امریکی سفارت خانوں اور سفارت کاروں کو ان کی سفارتی حدود میں پابند کیا جائے اور ملکی اور غیر ملکی مخبروں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ڈرون حملے اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ امریکہ کا مؤثر جاسوسی نظام ملک کے اندر موجود ہو اور اسے معلومات اندر سے فراہم کی جارہی ہوں۔ اس سلسلے میں فوری اقدام ضروری ہے۔ واضح رہے کہ سنوڈین نے جو سرکاری دستاویزات شائع ہونے کے لیے فراہم کی ہیں اور ان میں سے جو دی گارڈین اور نیویارک ٹائمز میں شائع ہوگئی ہیں، ان کی رُو سے سی آئی اے نگرانی پر جو ۶۰۰ ملین ڈالر سالانہ خرچ کر رہا ہے اس میں پاکستان کا حصہ تقریباً ۵۰ فی صد ہے۔ یہ ایک ہولناک صورت حال ہے اور اس سلسلے میں حکومت اور ہماری اپنی خفیہ ایجنسیوں کی خاموشی اور مداہنت تشویش ناک ہے۔ یہ پالیسی فوراً تبدیل ہونی چاہیے۔

۴۔ عالمی سطح پر اس مسئلے کو پوری تیاری کے ساتھ اُٹھایا جائے۔ آج عالمی فضا بدل رہی

ہے۔ جگہ کی قلت کے باعث ہم اس کی تفصیل نہیں دے سکتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ۱۲ برسوں میں یہ پہلا موقع ہے کہ اقوام متحدہ سے لے کر دنیا کے انسانی حقوق کے معروف ادارے اس مسئلے کو اُٹھا رہے ہیں اور اس کی بازگشت امریکہ، برطانیہ اور جرمنی کی پارلیمنٹ تک میں سنی جاسکتی ہے۔ ہماری سفارت کاری بڑی کمزور ہے۔ اس کے لیے عالمی سطح پر ایک مؤثر اور جارحانہ مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ معذرت خواہانہ انداز میں گزارشیں پیش کرنے کا طریقہ ترک کرنا ہوگا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے حقوق کے لیے لڑنا ہوگا۔ دنیا ہماری بات سننے پر مجبور ہوگی اور ہمیں اعوان و انصار ہر جگہ سے مل جائیں گے۔ حال ہی میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جو رپورٹ Will I be Next? US Drone Strikes in Pakistan کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس نے ایک تہلکہ مچادیا ہے۔ اسی طرح ڈرون کی تباہ کاریوں اور انسان کشی کے بارے میں جو ڈاکومنٹری 'جمائما فاؤنڈیشن' نے جاری کی ہے اس نے عالمی میڈیا کے یک رُخے پروپیگنڈے کا توڑ کیا ہے۔

ضرورت ہے کہ سفارتی محاذ، سیاسی پلیٹ فارم، میڈیا اور سوشل میڈیا، ہر جگہ اس سلسلے میں مؤثر کارروائی کی جائے۔ اس کے اثرات مرتب ہوں گے اور رائے عامہ تبدیل ہوگی۔ ضرورت یکسوئی کے ساتھ منظم انداز میں بڑے پیمانے پر جدوجہد ہے، کیا ہماری حکومت اس کے لیے تیار ہے؟

واضح رہے کہ پشاور ہائی کورٹ نے اپنے ایک واضح فیصلے میں ڈرون حملوں کو پاکستان کی آزادی اور علاقائی سالمیت پر حملہ اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا ہے اور حکومت کو حکم دیا ہے کہ ان کو روکنے کے لیے سیاسی، سفارتی کارروائی کرے اور ان کے غیر مؤثر ہونے کی صورت میں سپلائی لائن کو بند کرنے اور ڈرون حملوں کو عسکری قوت سے روکنے کا اقدام کرے۔ حکومت نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل نہیں کی جس کے معنی یہ ہیں کہ اب اس کی دستوری ذمہ داری ہے کہ ڈرون کو رُکوانے کے لیے مؤثر اقدام کرے۔

نئی سلامتی پالیسی کے خطوط

صوبہ خیبر پختونخوا اور ملک کے دوسرے مقامات پر جماعت اسلامی، تحریکِ انصاف اور دیگر قوتیں نیٹو کی سپلائی لائن روکنے کے لیے جو جمہوری اور قانونی جدوجہد کر رہی ہیں وہ اس لیے ہے کہ قوم بیدار ہو اور مرکزی حکومت پر دباؤ ڈالے کہ وہ ڈرون حملے بند کرانے کے لیے اپنا مؤثر کردار ادا کرے اور 'ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم' کی پالیسی ترک کرے۔ نیز یہ بھی دراصل امریکہ سے اپنے تعلقات کی تشکیل نو کے لیے ایک قدم ہے۔ ساتھ ساتھ امریکہ سے جن خطوط کے اندر تعلقات استوار ہونے چاہییں ان کو قومی مشاورت کے ساتھ مرتب کیا جائے، اور دو آزاد ممالک کے درمیان باوقار دوستی اور تعاونِ باہمی کا جو رشتہ ہونا چاہیے اس کے قیام کے لیے نئی پالیسی مرتب کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ محکومی کی پالیسی کو ختم ہونا چاہیے۔ دسیوں چھوٹے ممالک ایسے ہیں جنھوں نے سوپر پاورز کے ساتھ عزت اور وقار کے ساتھ باہمی اور مشترک مفادات کے حصول کے لیے پالیسیاں ترتیب دی ہیں اور دھونس اور دباؤ کے ہر حربے کو غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ کیوبا اور ایران اس کی اہم مثالیں ہیں۔ جنوبی امریکہ کے متعدد ممالک نے اپنی آزادی، عزت اور مفادات کی روشنی میں کامیاب خارجہ پالیسیاں بنائی ہیں اور امریکہ کو بھی ان کا پاس کرنا پڑا ہے۔

نیوکلیئر پاور کے سلسلے میں امریکہ اور ایران کا حالیہ معاہدہ اس کی ایک تازہ مثال ہے۔ شام پر فوج کشی کے امریکی اقدام کو لگام دینے کے سلسلے میں برطانیہ اور امریکہ کی پارلیمنٹ نے جو کردار ادا کیا اور امریکہ اور یورپی ممالک کو کس طرح اپنی پالیسی کی تشکیل نو کرنا پڑی، وہ سب حالیہ واقعات ہیں۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ عراق اور افغانستان کی جنگ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اب سوپر پاور کی پاور غیر محدود نہیں اور وہ ملک جسے کل تک ناگزیر ریاست کہا جا رہا تھا، اب اس کے اپنے دانش ور برملا کہہ رہے ہیں کہ وہ اب غیر ضروری

(Dispensable) ریاست ہے۔ ولی نصر کی تازہ کتاب اس کی مثال ہے۔

اس لیے ہمیں بھی کھلے ذہن کے ساتھ تمام معاملات کا جائزہ لے کر پوری حکمت اور حقیقت پسندی کے ساتھ، لیکن کسی بھی قسم کی مرعوبیت اور مجبوری کی سطح سے بلند ہو کر، اپنی پالیسی بنانی چاہیے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ نے بار بار آزاد خارجہ پالیسی، 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے نکلنے اور مسئلے کے سیاسی حل اور مذاکرات، ترقی اور سدِّجارحیت کے فریم ورک میں نئی پالیسی کی ضرورت کا مکمل اتفاق رائے سے اظہار کیا ہے، مگر حکومتوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ اب وقت آگیا ہے پالیسیاں قوم اور ملک کے مفاد میں اور عوام کی مرضی اور اُمنگوں کے مطابق بنائی جائیں اور عوام کے ساتھ دھوکے اور دوغلے پن کی روش کو یکسر ترک کر دیا جائے۔ حکومت کو جس پالیسی پر پورے اعتماد اور تیاری کے ساتھ اور پوری قوم اور اس کی قیادت کو ساتھ لے کر عمل پیرا ہونا چاہیے اس کے چند اہم پہلو یہ ہیں:

۱۔ خارجہ پالیسی اور دہشت گردی کے مقابلے کے لیے ہمہ جہتی پالیسی کو تمام سیاسی اور دینی قوتوں کی مشاورت سے مرتب کیا جائے، اور ملک اور علاقے کی روایات کی روشنی میں نہ صرف اسے مرتب کیا جائے بلکہ ان کی تنفیذ کے لیے بھی صحیح اور جامع حکمت عملی بنائی جائے۔

۲۔ حکومت قوم اور سیاسی اور دینی قیادت سے حقائق چھپانے کی پالیسی ترک کرے اور شفافیت کے ساتھ مشاورت کے ذریعے اعتماد کی فضا قائم کرے۔

۳۔ حکومت اور اس کے تمام اداروں اور ایجنسیوں کے درمیان مناسب ہم آہنگی ہونی چاہیے۔ پالیسی سازی میں ہر ایک اپنا کردار ادا کرے لیکن پالیسی بننے کے بعد ہر ادارہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے حصے کی ذمہ داری کو ادا کرے اور ریاست میں ریاست کی کیفیت نہ پیدا ہو۔ اسی طرح پالیسی کو دوغلے پن کے بدنما سایے سے مکمل طور پر پاک ہونا چاہیے۔

۴۔ پارلیمنٹ کی ۲۲۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء کی قرارداد، پارلیمانی کمیٹی برائے قومی سلامتی کی اپریل ۲۰۰۹ء کی سفارشات، پارلیمنٹ کی ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء کی قرارداد اور کُل جماعتی کانفرنس کی ۹ ستمبر ۲۰۱۳ء کی قرارداد کو پالیسی کی بنیاد بنایا جائے اور اس سلسلے میں باہمی مشاورت سے ایک ہمہ گیر پالیسی تشکیل دی جائے جس پر سب سختی سے عمل پیرا ہوں۔ پالیسی کے نفاذ کی نگرانی کا مؤثر نظام ہو اور پارلیمنٹ میں اس بارے میں کارکردگی کو بار بار پیش کیا جائے تاکہ قوم کو اعتماد رہے۔

۵۔ اس وقت اصل ہدف 'دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ' سے نکلنے، ملک میں ڈرون حملے رُکوانے اور بیرونی حکومتوں کی دراندازیوں اور خفیہ سرگرمیوں کو روکنے کو قرار دیا جائے۔ خود معیشت کی بحالی کے لیے امن کا قیام ضروری ہے۔ امریکہ کو اپنی پالیسی کے بارے میں تفصیلی طور پر باخبر رکھا جائے۔ جہاں جہاں تعاون ممکن نہیں وہ لال خطوط سے بھی واضح کر دیے جائیں۔ پھر ان کا پورا احترام کیا جائے۔ جہاں تک اندرونِ ملک مسئلے کے حل کا تعلق ہے اس سلسلے میں مذاکرات، ترقی اور سدِّجارحیت کے سہ گانہ تقاضوں کو سامنے رکھ کر ایک مربوط پالیسی اور پروگرام وضع کیا جائے۔

۶۔ حکومت کی پالیسیوں اور عوام کے جذبات، عزائم اور توقعات میں جو خلیج واقع ہو گئی ہے اسے دُور کیا جائے۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

۷۔ جس طرح امریکہ اور افغانستان کی حکومت اور وہاں کی دوسری قوتوں سے مذاکرات کیے جائیں، اسی طرح ملک میں بھی طالبان سے مذاکرات کے بارے میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ پالیسی بنائی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکہ کے بارے میں اور دہشت گردی کی جنگ سے نکلنے کے سلسلے میں ہماری پالیسی کے واضح ہو جانے اور اس پر عمل شروع ہونے سے پورا سیاسی منظرنامہ تبدیل ہو جائے گا اور طالبان کو بھی ہر قسم کی دہشت گردی سے اجتناب کرنے کے راستے پر لانا ممکن

ہو گا۔ ریاست کی رٹ کا قیام ضروری ہے مگر وہ محض قوت سے قائم نہیں ہو سکتی۔ گو قوت کا استعمال بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ رٹ قائم ہوتی ہے قانونی استحقاق (Legal legitimacy) اور اخلاقی قوت اور باہمی اعتماد سے، صرف ڈنڈے سے نہیں قائم ہوتی۔ ڈنڈے سے قبضہ (Occupation) تو ہو سکتا ہے، حکمرانی نہیں۔ اور یہی ہمارا مسئلہ ہے۔ فاٹا کو ہم نے ۶۶ برس تک 'علاقہ غیر' بنا رکھا ہے اور اس پر دستور تک نافذ نہیں کیا جس کی دفعہ ۲۵۶ نے اسے دستور کی دسترس سے باہر رکھ دیا ہے اور باتیں کرتے ہیں حکومت کی رٹ کی۔ ایک تدریج سے، مقامی حالات اور روایات کی پاس داری کے ساتھ پہلے اس علاقے کو دستور کی دسترس میں لایئے، وہاں قانون کی حکمرانی اور حقوق کے احترام کا اہتمام کیجیے، تو پھر ان شاء اللہ رٹ بھی قائم ہو گی اور ناپسندیدہ افراد سے بھی نجات پائی جاسکے گی۔

۸۔ بلاشبہ ان اقدامات کے ساتھ ساتھ معیشت کی اصلاح اور استحکام اور ایک ایسی معاشی پالیسی کا اجرا ضروری ہے جو ملک کو خود انحصاری کے راستے پر گامزن کر سکے۔ سیاسی آزادی، حاکمیت اور قومی وقار کا حقیقی تحفظ اور اظہار اسی وقت ممکن ہے جب معاشی طور پر ملک میں خود انحصاری کی کیفیت ہو۔ بیرونی امداد اور قرضوں پر انحصار کو بتدریج ختم کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے نئی اور مؤثر حکمت عملی وقت کی ضرورت ہے۔ بیرونی تعلقات میں بنیادی بات جو امداد یا قرض یا سرمایہ کاری سے بھی کہیں زیادہ ہے، وہ شرائط ہیں جن پر یہ معاملات طے ہوتے ہیں۔ مشروط امداد جو بیرونی قوتوں کے ایجنڈے کا حصہ ہوں غلامی کی زنجیریں ہیں جن کو کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ رہا تجارت اور باہم رضامندی کی بنیاد پر معاشی اور مالی تعلقات تو وہ خود انحصاری سے متصادم نہیں۔ ان کو گڈمڈ کرنا صحتِ فکر کے منافی ہے۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ بیرونی امداد کی بنیاد پر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکی لیکن محنتی اور خوددار اقوام پابندیوں کے باوجود ترقی کرتی ہیں بلکہ ان حالات میں زیادہ

اچھے انداز میں ترقی اور خود انحصاری کے اہداف کو حاصل کر سکی ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ قومی سلامتی کی نئی پالیسی کے ایک اہم حصے کے طور پر معاشی پالیسی کی تشکیل نو بھی ضروری ہے۔ اس قوم میں بڑی صلاحیت ہے بشرطیکہ اسے صحیح مقاصد کے لیے صحیح طریقے سے منظم اور متحرک کیا جائے۔ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

(عالمی ترجمان القرآن، دسمبر ۲۰۱۳)

زمینی حقائق کے اِدراک کی ضرورت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر وہ پالیسی اور اقدام جو بیرونی یا اندرونی دباؤ کا نتیجہ ہو یا جسے بڑی حد تک جذبات، غصے اور انتقام کے جذبے کے تحت اختیار کیا جائے، وہ تباہ کن ہوتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس کی بدترین مثال وہ ردعمل ہے، جو امریکہ نے ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے دہشت گردی کے افسوس ناک اور قابلِ مذمت واقعے کے ردعمل کے طور پر اختیار کیا، اور جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ دہشت گردی کا سدّباب نہ ہوسکا، بلکہ اس کو عالمی سطح پر ہزار گنا زیادہ فروغ حاصل ہوگیا۔ آج دنیا، بشمول امریکہ، ۲۰۰۱ء کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی غیر محفوظ ہے۔ بلاشبہ ان ۲۹۰۰ افراد کی ہلاکت ایک دل دوز سانحہ اور کھلا ظلم تھا، جو نائن الیون کے اقدام کا نشانہ بنے۔ لیکن کیا اس حقیقت سے آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں کہ 'دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ' کے نتیجے میں ان تقریباً ۳ہزار جانوں کے مقابلے میں افغانستان میں تقریباً ایک لاکھ ۲۰ ہزار افراد اور عراق میں ۶ لاکھ افراد موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے ہیں۔ صرف افغانستان میں ۲۰۱۳ تک خود امریکہ کے ۲۸۰۶ فوجی ہلاک ہوئے اور ۱۸ ہزار زخمی ہوچکے ہیں۔ امریکہ کے جتنے فوجی افغانستان گئے ہیں ان میں ۱۰ فی صد ہمیشہ کے لیے اپاہج ہوچکے ہیں۔ سینکڑوں نے خودکشی کی ہے اور دسیوں ایسے ہیں، جنھوں نے دیوانگی کے عالم میں اپنے ہاتھوں امریکی اور نیٹو افواج ہی کو نشانہ بناڈالا ہے۔ برطانیہ کے ۴۴۷ فوجی ہلاک اور کئی ہزار زخمی ہوئے ہیں۔ امریکہ صرف افغانستان کی جنگ پر ایک ہزار ارب ڈالر خرچ کرچکا ہے اور برطانیہ ۴۰ ارب پونڈ اس آگ میں جھونک چکا ہے۔ اس سب کے باوجود امریکہ اور نیٹو افواج کو ذہنی اور سیاسی و عسکری دونوں قسم کی شکست سے سابقہ ہے۔ افغانستان خود امن و چین سے محروم ہے۔ افغانستان کی فوج اور معیشت دونوں امریکہ

کی مدد کی محتاج ہیں۔ افغان بجٹ کا ۸۰ فی صد امریکی امداد پر منحصر ہے، اور باقی بجٹ کا بڑا انحصار افیون کی تجارت پر ہے۔

رہی افغان عوام کی حالتِ زار تو افغانستان کے پے در پے دوروں کے بعد ایک امریکی مصنف اور صحافی پیٹرک کک برن (Patrick Cockburn) کاؤنٹر پنچ کے ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ء کے شمارے میں لکھتا ہے:

> بلاشبہ جو رقم افغانستان پر خرچ کی جارہی ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ افغانستان میں خرچ کی جارہی ہے۔ لیکن اس بات کو پیش نظر رکھ کر بھی بہت بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے کے باوجود سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ۶۰ فی صد بچے غذا کی کمی کا شکار ہیں اور صرف ۲۷ فی صد افغانوں کو پینے کا صاف پانی مہیا ہے۔ بہت سے باہر سے رشتہ داروں کی بھیجی ہوئی رقم سے زندہ ہیں یا منشیات کے کاروبار سے جو افغانستان کی قومی آمدن کا ۱۵ فی صد تک ہے۔ یہ اعداد و شمار افغانستان اینلسٹ نیٹ ورک کابل سے وابستہ تھامس رٹگ کے جائزے: ''افغانستان میں بین الاقوامی مداخلت کے ۱۲ سال'' سے سامنے آئے ہیں۔ اس مستند جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج افغانستان کہاں کھڑا ہے؟ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی فوجی مداخلت مکمل ناکامی پر منتج ہوئی ہے۔ طالبان کچلے نہیں جاسکے ہیں جو ملک کے تمام حصوں میں فعال ہیں، اور ہلمند جیسے صوبوں میں امریکہ اور برطانیہ کی افواج کے جاتے ہی اقتدار سنبھال لیں گے۔ غیر ملکی فوجوں کی پشت پناہی کے باوجود حکومتِ افغانستان کا کنٹرول دارالحکومت کے ضلع سے باہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر ختم ہوجاتا ہے۔ پورے افغانستان پر عموماً فوجی طور طریقوں کے بارے میں بات چیت کی جاتی ہے، جب کہ امریکہ برطانیہ کی ناکامی کی سب سے اہم وجوہ سیاسی ہیں۔ بہت سے افغان بدتر انجام سے خوف زدہ ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ۲۰۱۴ء میں ۱۹۹۰ء کے عشرے کا

ظلم اور انارکی کا دور جب جہادی دستے افغانستان پر حکومت کرتے تھے، آجائے گا۔

امریکہ کو اس جنگ کے نتیجے میں بدنامی، شکست اور پسپائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ افغانستان تباہ و برباد ہو گیا۔ جس دہشت گردی کے خاتمے کے لیے دنیا کو اور خصوصیت سے افغانستان، پاکستان اور شرق اوسط کو جنگ کی آگ میں جھونکا گیا، وہ سب ماقبل سے بُرے حال میں ہیں۔ یہ نتیجہ ہے ایک بدمست سوپر پاور کے اس ردعمل کا، جس کی بنیاد دلیل، حق و انصاف کے اصول اور زمینی حقائق کے صحیح اِدراک اور حکمت و توازن کی بنیاد پر پالیسی سازی کے فقدان پر مبنی ہے۔ طاقت کے زعم میں، سیاسی اور عسکری غرور و تکبر اور سب سے بڑھ کر غصے اور انتقام کے جذبات سے آلودہ تھی۔ اس ساری تباہی کی بڑی وجہ امریکی صدر بش کا وہ ردعمل تھا، جس کی کوئی عقلی بنیاد نہ تھی بلکہ غرور، غصے اور انتقام کے جذبات تھے جن سے مغلوب ہو کر واحد سوپر پاور کے صدر نے امریکہ کی سیاسی اور معاشی قوت پر ضرب لگانے والوں کو تہس نہس کرنے کے جذبات میں بہنا پسند کیا۔ موصوف نے مناسب تحقیق کے بغیر اور عالمی قانون کو حقارت سے نظرانداز کرتے ہوئے 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام پر افغانستان پر فوج کشی کر ڈالی اور پھر اس کا دائرہ بلاجواز عراق تک بڑھا دیا۔ پاکستان کو کان پکڑ کر اس جنگ میں جھونکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ پوری دنیا ۱۲ برس سے اس عذاب میں مبتلا ہے۔ عراق سے تو امریکی افواج واپس چلی گئیں مگر عراق خانہ جنگی کی آگ میں آج تک جل رہا ہے۔ افغانستان سے امریکی فوجوں کی واپسی کا ٹائم ٹیبل دیا جا رہا ہے مگر خانہ جنگی اور علاقائی بدامنی کے بھوت فضا میں منڈلا رہے ہیں اور امن اور سلامتی کا دُور دُور پتا نہیں۔

ماضی کی حکمت عملی کے نتائج

اگر امریکہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر غرور، غصے اور انتقام کی بنیاد پر دنیا کو جنگ میں جھونکا، تو پاکستان کے سیاہ و سفید پر قابض جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے امریکی دباؤ میں شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ، اور قومی مفادات اور عوامی جذبات کو یکسر نظرانداز

کر کے امریکہ کی اس جنگ میں اپنے کو شریک کر کے اپنے مسلمان ہمسایہ برادر ملک پر فوج کشی کے لیے امریکہ کو نہ صرف ہر سہولت دے ڈالی، بلکہ اپنی زمینی اور فضائی حدود پر امریکہ کو تسلط اور غلبہ عطا کیا۔ امریکہ کے احکام پر اپنے شہریوں اور برادر ملک کے ان مہمانوں کو جو ہماری امان میں تھے، ڈالروں کے عوض امریکہ کے حوالے کیا اور اس سلسلے میں سفارتی اور اسلامی آداب کو بھی بُری طرح پامال کیا۔ اس کی شرم ناک داستان پاکستان میں افغانستان کے سفیر مُلّا عبدالسلام ضعیف کی کتاب My Life with the Taliban میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پاکستان کو ان ۱۲ برس میں دینی، سیاسی، عسکری، معاشی، غرض یہ کہ ہر میدان میں بے پناہ نقصانات ہوئے اور پاکستان عملاً اپنی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہو کر رہ گیا۔ ۵۰ ہزار سے زیادہ افراد جان کی بازی ہار گئے، جن میں ۶ سے ۸ ہزار افراد کا تعلق فوج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے ہے۔ زخمیوں کی تعداد اس سے دو تین گنا زیادہ ہے، اور جو نقل مکانی پر مجبور ہوئے ان کی تعداد ۳۰ لاکھ سے متجاوز ہے۔ مالی اور معاشی اعتبار سے نقصان کا کم سے کم اندازہ ایک سو ارب ڈالر کا ہے اور سب سے بڑھ کر پورے ملک کا امن اور چین درہم برہم ہو گیا۔ جو دوست تھے وہ دشمن بن گئے اور جو دشمن تھے انھوں نے ملک کے طول و عرض میں اپنے اثرات بڑھا لیے۔ ملک کے حالات اور پالیسیوں میں امریکہ کا عمل دخل اتنا بڑھ گیا اور اس کی خفیہ ایجنسیوں اور کارندوں کو ایسے ایسے مقامات تک رسائی حاصل ہو گئی، جس سے ہماری سالمیت معرضِ خطر میں ہے۔ عوام اور حکمرانوں، عوام، فوج اور قانون نافذ کرنے والے اداروں میں دُوری بڑھ گئی۔ جن کے درمیان رشتے کی امتیازی خصوصیت اعتماد، افتخار اور محبت تھی، وہ بُری طرح متاثر ہوئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب بے اعتمادی اس حد کو پہنچ گئی کہ جنرل پرویز مشرف کی حکومت نے باقاعدہ فوجی اہلکاروں کو ہدایت دی کہ عام سواریوں میں فوجی وردی میں سفر نہ کریں۔ جس فوج کو عوام اپنی زندگی، آزادی اور عزت کا نگہبان سمجھتے تھے اور جس سے نسبت پر فخر محسوس کرتے تھے، اس سے تعلقات اور اعتماد میں یہ کمزوری صرف اور صرف اس وجہ سے رُونما ہوئی کہ اس وقت کی

قیادت نے عوام کے جذبات اور قومی مفادات سے صرفِ نظر کر کے، امریکہ کی اس جنگ میں ملک اور اس کی قانون نافذ کرنے والی قوتوں کو جھونک دیا تھا۔

۲۰۰۱ء میں امریکہ کے لیے پاکستان کی زمینی اور فضائی حدود کو کھول دیا گیا تھا۔ پھر ۲۰۰۴ء سے عملاً پاکستانی افواج کو بھی آہستہ آہستہ اس جنگ میں شریک کر دیا گیا، جس میں ۲۰۰۷ء کے بعد شدت آ گئی۔ یہی وہ سال ہے جب پاکستان کے قبائلی علاقے میں باقاعدہ تحریکِ طالبان پاکستان کی تشکیل ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ روز بروز تصادم بڑھتا گیا، اور معصوم عوام دونوں طرف سے نشانہ بننے لگے۔ آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ نہ سرکاری املاک، فوجی چھاؤنیاں اور پولیس کی چوکیاں دہشت گردی سے محفوظ ہیں اور نہ مساجد، امام بارگاہیں، دینی مدارس، تعلیمی ادارے اور عام آبادیاں امن کا گہوارا ہیں۔

دہشت گردی آج ملک عزیز کی سلامتی کے لیے ایک اہم ترین خطرہ بن گئی ہے۔ دہشت گردی کی ہر شکل سے نجات وقت کی ضرورت ہے، خواہ اس کا ارتکاب افراد، گروہ یا مسلح تنظیمیں کر رہی ہوں یا خود ریاستی ادارے اپنی حدود سے بڑھ کر ان کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومت تمام دینی اور سیاسی قوتیں اور قوم کے تمام محب وطن عناصر مل کر قومی سلامتی کی پالیسی مرتب کریں اور سب مل جل کر اس پر عمل کو یقینی بنائیں۔ جو پالیسی بیرونی دباؤ کے تحت بنے گی یا جو اصول قومی عزائم اور مفادات کے مقابلے میں، گروہی جذبات، غصے، انتقام یا مفاد پرست لابیوں کے اثر و نفوذ کے نتیجے میں وجود میں آئیں گے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ گذشتہ ۱۲ برسوں میں برپا ہونے والی تباہی کا بڑا سبب وہ پالیسیاں ہیں جو بیرونی دباؤ یا اندرونی کمزوری کے تحت بنائی گئی تھیں۔ اب اس روش سے مکمل اجتناب کے ساتھ خالص قومی مقاصد، ملکی مفادات، عوام کے جذبات اور احساسات کی بنیاد پر نئی پالیسیوں کی تشکیل اور تنفیذ کی ضرورت ہے۔

جذباتی انداز میں یہ کہہ دینا کہ "پہلے یہ جنگ ہماری نہیں تھی، لیکن اب بن گئی ہے" ایک نامعقول اور فریب خوردگی پر مبنی دعویٰ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دہشت گردی

اور اس کی مختلف اقسام اور ان کے اسباب سب پر نگاہ ڈالی جائے، اور حالات کے معروضی تجزیے کے بعد ایسی ہمہ گیر پالیسی بنائی جائے، جو مسئلے کے ہر ہر پہلو کا احاطہ کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب حقائق کو بنیاد بنایا جائے اور جذبات اور تعصبات کو فیصلوں پر اثرانداز نہ ہونے دیا جائے۔

اس وقت کچھ طاقت ور لابیاں ایک خاص زاویہ بنانے میں مصروف ہیں اور ایک ایسی جذباتی فضا بنانے کے درپے ہیں، جس میں حق و صداقت اور انصاف اور توازن کی بات نامطلوب بن جائے۔ انجامِ کار ملک اور فوج کو ایک ایسے آپریشن میں جھونک دیا جائے، جو امریکہ کے مقاصد، مفادات اور ایجنڈے کا تو حصہ ہو اور اوباما اور جان کیری کی 'Do more' [اور مارو] کی تعمیل پر پاکستان کو جنگ کی ایک ایسی آگ میں جھونک دے، جو افغانستان سے امریکہ کے انخلا کے بعد بھی پاکستان اور افغانستان کو بھسم کرتی رہے۔

یہ وقت ٹھنڈے دل سے پورے معاملے کے صحیح تجزیے کے بعد ایسی پالیسیاں وضع کرنے کا ہے جو پاکستان، افغانستان اور اس علاقے کے مفاد میں ہوں اور فوری اور دُور رس امن و سلامتی کی ضمانت دے سکیں۔ امریکہ کو تو یہاں سے جانا ہے، لیکن پاکستان اور افغانستان دائمی ہمسایہ ممالک ہیں اور ہمیں ایک ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کے لیے سہارا بننا ہے۔ اس کے لیے حالات کو امریکہ کی نگاہ سے دیکھنے اور امریکی مفادات کے چنگل سے نکل کر اپنے اور اپنے برادر ملک کے مفادات کی روشنی میں حالات کی صورت گری کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

ہمیں اس امر کو سمجھ لینا چاہیے کہ امریکہ کا کھیل ناکام ہو چکا ہے۔ اب پاکستان اور افغانستان کو مل کر آگ بجھانے اور نئی زندگی کی بساط بچھانے کی فکر کرنا ہے۔ بلاشبہہ آج کا افغانستان بدامنی اور تصادم کی آماج گاہ بنا ہوا ہے اور پاکستان بھی، خصوصاً اس کے شمالی اور مغربی علاقے کے طول و عرض میں دہشت گردی کا بازار گرم ہے۔ کراچی شہر اور صوبہ بلوچستان بھی اپنے اپنے طور پر دہشت گردی کی گرفت میں ہیں۔ نو سال سے جاری فوجی اور

نیم فوجی آپریشنوں کے باوجود حالات قابو میں نہیں آرہے۔ جس پالیسی کے نتیجے میں گذشتہ نو سال میں امن قائم نہیں ہوا، بھلا اس کو کچھ اور بھی دو آتشہ کر کے کس طرح کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔ جب خود امریکہ اپنی ساری عسکری اور معاشی طاقت اور ٹیکنالوجی کی فوقیت کے باوجود ۱۲ برس تک آگ اور خون کی بارش کر کے افغانستان سے ناکام و نامراد واپسی اور پسپائی پر مجبور ہو چکا ہے، تو اس تناظر میں یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ ہم اس ناکام حکمت عملی کے وارث اور ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کے اسیر بن جائیں۔

بلاشبہ گذشتہ چند دنوں میں ایسے ہولناک واقعات ہوئے ہیں جنھوں نے سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے لیکن غصے اور انتقام کے جذبات کے زیر اثر ردعمل کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وقت ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے اور تمام ضروری پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نئی حکمت عملی بنانے کا ہے۔ ورنہ اس عاجلانہ قوت آزمائی کے نتائج ان تباہ کن نتائج سے مختلف نہیں ہو سکتے، جو جارج بش اور ان کے حواریوں کے نائن الیون کے موقعے پر جذباتی اور انتقامی ردعمل سے رُونما ہوئے، اور جن کی آگ میں آج تک سب جل رہے ہیں۔

عالمی رائے عامہ اور ردعمل

گیلپ انٹرنیشنل نے نائن الیون کے واقعے کے بارے میں امریکی قیادت کے ردعمل کے بارے میں، عالمی رائے عامہ کی جو تصویر پیش کی ہے، اسے آج نگاہوں کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ۱۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو اصل واقعے سے صرف آٹھ دن بعد دنیا کے ۲۹ ممالک میں سے ۲۷ کی آبادی کی اکثریت نے افغانستان پر فوجی حملے کی مخالفت کی تھی۔ گیلپ رپورٹ کے الفاظ ہیں: یہ بات دل چسپ ہے کہ ۲۹ ممالک میں سے جن ۲۷ میں یہ عالمی جائزہ گیلپ انٹرنیشنل نے لیا، اکثریت نے فوجی کارروائیوں کی مخالفت کی۔ دو استثنا میں ایک امریکہ تھا جہاں ۵۴ فی صد لوگوں نے فوجی کارروائیوں کی حمایت کی، اور دوسرا اسرائیل، جہاں ۷۷ فی صد لوگوں نے فوجی کارروائیوں کی حمایت کی۔

واضح رہے کہ امریکہ میں بھی ۴۶ فی صد عوام نے اس فوج کشی کی مخالفت کی یا کم از کم تائید نہیں کی۔ پاکستان کی رائے عامہ کی جو تصویر اس جائزے میں آتی ہے، وہ پاکستانی عوام کی سیاسی بصیرت کا مظہر ہے۔ صرف ۷ فی صد کی رائے تھی کہ پاکستانی حکومت کو امریکی کارروائی کا ساتھ دینا چاہیے، جب کہ ۶۳ فی صد کا فیصلہ یہ تھا کہ اس وقت کی افغانستان حکومت کا ساتھ دیا جائے اور ۲۷ فی صد نے غیر جانب دار رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ گویا عملاً ۹۰ فی صد نے امریکہ کی اس جنگ سے الگ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن اس وقت پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے ۹۰ فی صد عوام کی رائے کو ٹھکرا کر امریکی دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور پورے ملک کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی عوام کی اکثریت نے اسے کبھی اپنی جنگ نہیں تصور کیا اور آج بھی دہشت گردی کا نشانہ بننے اور ۵۰ ہزار سے زیادہ افراد کی قربانی دینے کے باوجود، وہ اسے اپنی جنگ نہیں سمجھتے اور اس سے نکلنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

پاکستانی عوام کی نگاہ میں امریکہ کو نائن الیون کے اصل مجرموں کو قانون اور انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے، بین الاقوامی قانون کے مطابق کارروائی کرنا چاہیے تھی اور اُس وقت کی افغان حکومت ہر ممکن تعاون کے لیے تیار بھی تھی۔ لیکن امریکہ طاقت کے نشے میں بدمست تھا اور انتقام کی آگ میں دہک رہا تھا۔ اس نے بین الاقوامی قانون اور عالمی رائے عامہ، اخلاق اور انصاف، انسانیت اور بُردباری سبھی کچھ کو نظر انداز کر کے فوج کشی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ اس زعم میں تھا کہ چند ماہ میں کامیاب و کامران ہو جائے گا۔ امریکی جنگباز قیادت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ افغان عوام ایسی مزاحمت کریں گے کہ امریکی اور نیٹو افواج کو کئی برسوں بلکہ دہائیوں کے بعد بھی ناکام و نامراد واپس لوٹنا پڑے گا۔ امریکی اور عالمی تجزیہ نگار بہ یک زبان یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ: ''یہ جنگ غلط تھی'' اور اب امریکہ اور اس کے اتحادی جان بچا کر نکل جانے کے لیے سرگرداں ہیں۔

نیویارک ریویو آف بکس کے ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں War on

Terror پر ایک اہم کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میلیسی روتھوین (Malisi Ruthven) لکھتی ہیں کہ: ''اس کے علاوہ کوئی نتیجہ نکالنا مشکل ہے کہ امریکہ نے ایک غلط جنگ، غلط حکمت عملی سے اور غلط دشمن کے خلاف لڑی۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کے نتائج بھی غلط کے علاوہ کچھ اور نہ ہوسکتے تھے''۔

امریکہ اور یورپ کے چوٹی کے تجزیہ نگار صاف الفاظ میں لکھ رہے ہیں کہ: ''امریکہ یہ جنگ ہار چکا ہے''۔ دسیوں کتابوں اور بیسیوں مضامین میں اس کا اعتراف کیا جارہا ہے کہ: ''امریکہ کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ یا کھلی شکست کا اعتراف کرے یا پھر مذاکرات کے ذریعے کوئی فرار کی راہ نکالے''۔ مثال کے طور پر امریکہ کے موقر جریدے فارن افیئرز کے ایک تازہ شمارے (ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۳ء) میں جارج واشنگٹن یونی ورسٹی میں علمِ سیاسیات کے پروفیسر اسٹیفن بڈل (Stephen Biddle) نے اپنے مضمون 'افغانستان میں جنگ کا خاتمہ' میں واضح طور پر لکھا ہے کہ: ''شکست یا مذاکرات کے سوا کوئی راستہ نہیں''۔ ساری بحث کا خلاصہ بس یہ ہے کہ:

> اس جنگ کے صرف دو حقیقی متبادل ہیں، جن میں سے کوئی بھی خوش گوار نہیں۔ ایک یہ کہ طالبان سے مذاکرات کے بارے میں سنجیدہ ہوجائیں، گو یہ بھی کوئی امرت نہیں لیکن یہ مکمل شکست کا واحد متبادل ہے۔

لندن کے معروف اخبار دی گارڈین نے ۲۳ جنوری ۲۰۱۴ء کے اداریے میں کھل کر اعتراف کیا ہے کہ: ''آج تمام دنیا کے عوام جنگ سے تنگ آگئے ہیں اور جرنیلوں کی مہم جوئی سے نالاں ہیں۔ وقت کی اصل ضرورت یہ ہے کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے جو حکمت عملی اب تک بنائی گئی تھی، اس پر نظر ثانی کی جائے اور زمینی حقائق کی روشنی میں سیاسی مسائل کے سیاسی حل کا راستہ اختیار کیا جائے، کیونکہ فوجی حل کہیں بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ عوام جس نتیجے پر پہنچ گئے ہیں وہ یہ ہے کہ عراق کی جنگ مکمل طور پر ناکام تھی اور افغانستان میں بھی جنگ کا نتیجہ اس سے مختلف نظر نہیں آتا''۔

برطانیہ کی پالیسیوں پر گرفت کرتے ہوئے اداریے میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے کہ: ''دونوں محاذ پر برطانیہ نے سخت ٹھوکر کھائی۔ فوجی محاذ پر اس جنگ میں شرکت اور ملکی سلامتی کے محاذ پر ایسے قوانین بنائے جو حقوقِ انسانی پر ضرب کی حیثیت رکھتے تھے''۔ (دی گارڈین، ۲۳ جنوری ۲۰۱۴ء)

طالبان اور پاکستانی رائے عامہ

دراصل ہم اہلِ پاکستان کا مسئلہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ عبرت کا مقام یہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ میں، جہاں دہشت گردی کے مقابلے کے لیے فوجی آپریشن اور ملک میں سخت قوانین جو انصاف کے مسلّمہ اصولوں اور حقوقِ انسانی کے معروف ضابطوں سے انحراف پر مبنی اقدام کی ناکامی کا کھلم کھلا اعتراف ہیں، وہاں بھی سیاسی حل کے لیے نئے راستے تلاش کیے جارہے ہیں مگر ہم ہیں کہ آنکھیں بند کرکے انھی ناکام پالیسیوں کے اتباع میں مکھی پر مکھی مارنے کو اپنی معراج سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ خود پاکستان میں عوام کی سوچ بالکل مختلف ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ گیلپ اور Pew کے جائزے پاکستان کے عوام کی سوچ کے عکاس ہیں جن کے مطابق پاکستانی عوام اور پاکستان کے ہر صوبہ کے عوام کی بہت بڑی اکثریت کی رائے ہے کہ پاکستان کو امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہرگز تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری جانب Pew Survey کے Global Attitudes Project میں، جو ۲۷ جون ۲۰۱۲ء کو منعقد ہوا تھا، ۷۴ فی صد پاکستانیوں نے امریکہ کو 'ایک دشمن' ملک قرار دیا تھا۔ اسی ادارہ کی ۳۰ جون ۲۰۱۱ء کی رپورٹ Support for Campaign Against Extremists Wanes (انتہاپسندی کے خلاف عسکری کارروائیوں کی تائید میں کمی) میں رائے عامہ کا یہ چشم کشا فیصلہ پیش کیا گیا ہے، کہ فاٹا میں فوجی آپریشن جو ۲۰۰۷ء میں شروع ہوا تھا، اسے حاصل شدہ عوامی تائید میں مسلسل کمی ہورہی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ پاکستانی عوام دہشت گردی کو ایک اہم مسئلہ سمجھتے ہیں، لیکن

رائے عامہ کے تمام ہی سروے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے Threat perception (اندیشوں پر مبنی خیال) میں امریکہ سب سے اُوپر ہے، اور آبادی کا ۷۳ فی صد اسے خطرہ سمجھتا ہے۔ بھارت کو خطرہ سمجھنے والوں کی تعداد ۵۹ فی صد ہے، جب کہ طالبان کو خطرہ سمجھنے والوں کی تعداد ۲۳ فی صد ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ عوام کی نگاہ میں دہشت گردی کی سب سے بڑی ذمہ داری بھارتی اور امریکی خفیہ ایجنسیوں پر ہے، یعنی ۳۲ فی صد اور ۳۱ فی صد۔ گویا ۶۳ فی صد کی نگاہ میں اس بدامنی، تشدد اور دہشت گردی میں بیرونی ہاتھ سب سے اہم عامل ہے، خواہ اس کا ذریعہ کوئی بھی ہو۔ دہشت گردوں کو براہِ راست ذمہ دار ٹھہرانے والے ۲۶ فی صد ہیں۔ ۲۰۰۹ء میں طالبان کا نام لینے والے صرف ایک فی صد تھے۔ بعد کے متعدد جائزوں میں اس انداز میں سوال نہیں پوچھا گیا، تاہم 'گیلپ' اور 'پیو' (Pew) دونوں ہی کے جائزوں میں طالبان کی تائید میں نمایاں کمی آئی ہے اور طالبان کی کارروائیوں کی مذمت کرنے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ 'پیو' کے ۲۰۱۱ء کے سروے میں ۲۳ فی صد نے طالبان سے خطرہ محسوس کیا اور اور گیلپ کے ایک سروے کے مطابق دسمبر ۲۰۰۹ء میں طالبان کے حوالے سے منفی تصور ۷۲ فی صد تک بڑھ گیا۔ عام انسانوں کی ہلاکت اور مساجد، امام بارگاہوں، بازاروں، اسکولوں اور مدرسوں پر حملوں کے ردعمل میں طالبان کے بارے میں منفی رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔

نئی حکمت عملی کے رہنما خطوط

ان معروضات کی روشنی میں، پالیسی سازی کے لیے چند نہایت اہم پہلو سامنے آتے ہیں، جن کی ہم نشان دہی کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ پالیسی سازی میں اصل اہمیت ملک اور قوم کے مقاصد، اس کے مفادات اور اس کے عوام کی سوچ، خواہش اور عزائم کی ہونی چاہیے۔ جو پالیسی بیرونی دباؤ یا گروہی اور کسی خاص اداراتی سوچ، عصبیت یا جذبات کی روشنی میں بنائی جائے گی، وہ مفید اور مناسب نہیں ہوگی۔

۲۔ اصل مسئلہ امریکہ کی 'دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ' ہے اور پاکستان میں دہشت گردی کے مسئلے کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ بلاشبہہ دوسری انواع کی دہشت گردیاں بھی ہیں اور ان کے لیے بھی مؤثر حکمت عملی اور پروگرام درکار ہیں، لیکن مرکزی اہمیت بہرحال امریکہ کی اس جنگ اور اس میں ہمارے کردار سے منسوب ہے۔ طالبان کیا مطالبہ کر رہے ہیں اس سے قطع نظر، پاکستانی قوم کا اس جنگ کے بارے میں ایک واضح تصور ہے اور ہمارے پالیسی ساز اداروں کو اصل اہمیت عوام کی اس رائے کو دینا چاہیے۔

پاکستانی عوام اس جنگ کو ہرگز جاری نہیں رکھنا چاہتے۔ وہ پاکستان کو امریکہ کی اس جنگ سے نکالنے اور ایک آزاد خارجہ پالیسی بنانے کے حق میں ہیں۔ مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں انھوں نے اُن جماعتوں کو رد کر دیا، جو اس جنگ میں پاکستان کی شرکت کی ذمہ دار تھیں اور ان جماعتوں کو اعتماد کا ووٹ دیا جو آزاد خارجہ پالیسی کی داعی اور اس جنگ سے نکلنے اور مسائل کے سیاسی حل کی خواہش مند تھیں۔ عوام کا یہ مؤقف ۲۰۰۱ء سے واضح تسلسل رکھتا ہے۔

۲۰۰۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں جو پارلیمنٹ بنی تھی، اس نے بھی عوام کے ان جذبات کو تسلیم کیا تھا اور ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کی متفقہ قرارداد میں آزاد خارجہ پالیسی، دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کے بارے میں نظرثانی، مسائل کے سیاسی حل اور مذاکرات، ترقی اور ردِ جارحیت (Deterrence) کے سہ نکاتی فارمولے کا واشگاف اظہار کیا تھا۔ پھر اپریل ۲۰۰۹ء میں پارلیمانی کمیٹی برائے قومی سلامتی نے بھی، جس میں تمام جماعتوں کو نمائندگی حاصل تھی، مکمل اتفاق رائے کے ۵۵ نکات پر مشتمل ایک واضح پروگرام قوم اور پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسی طرح پارلیمنٹ نے ایک بار پھر ۱۴ مئی ۲۰۱۱ء کی قرارداد میں اس پالیسی کا اظہار کیا تھا اور ۹ ستمبر ۲۰۱۳ء کی کُل جماعتی کانفرنس میں مذاکرات کو اولین ترجیح دے کر موجودہ

پارلیمنٹ کی تمام جماعتوں نے اس پالیسی کی توثیق کی تھی۔ اصل مسئلہ پالیسی کے اہداف اور مقاصد کے بارے میں ابہام کا نہیں ہے، حکومت اور اس کے اداروں کی طرف سے قومی پالیسی پر عمل نہ کرنے کا ہے۔

۳۔ پاکستان میں پائی جانے والی دہشت گردی کی کم از کم پانچ بڑی شکلیں ہیں جن میں ہر ایک کی نوعیت، اسباب اور اہداف کو سمجھنا اور ان کی روشنی میں اس کا مقابلہ کرنے کی حکمت عملی بنانا ضروری ہے:

- پہلی اور سب سے اہم شکل وہ ہے جس کا تعلق امریکہ کی 'دہشت گردی کے خلاف جنگ'، افغانستان پر فوج کشی، افغانستان میں امریکی استعمار کی مزاحمت، اور پاکستان کے اس جنگ میں امریکہ کے حلیف اور مددگار بننے سے رُونما ہوئی ہے۔ جس وقت تک پاکستان نے امریکہ کے دباؤ میں عملاً اپنی فوج کو اس جنگ میں نہیں جھونکا تھا، پاکستان کی سرزمین پر اس راستے سے دہشت گردی نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جب ہماری فوج کو اس میں جھونک دیا گیا، تو افسوس ناک ردعمل بھی رُونما ہوا، جو بڑھتے بڑھتے خود ایک فتنہ بن گیا۔ خودکش بمبار بھی اس کا ایک آلۂ کار بن گئے۔ باجوڑ اور اسلام آباد میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ بھی اس خونیں سلسلے کے سنگ میل بن گئے۔ پھر مسجد اور مدرسہ، سرکاری دفاتر اور افواج کے مورچے، حتّٰی کہ بازار اور گھربار سب نشانہ بننے لگے اور معصوم انسانوں کا لہو ارزاں ہو کر بہنے لگا۔ بچے، عورتیں، مسافر، مریض، کوئی بھی اس خون آشامی کی زد سے نہ بچ سکا۔ شریعت، قانون، اخلاق، روایات کون سی حد ہے جو اس میں پامال نہیں کی گئی اور بدقسمتی سے ہر فریق کی طرف سے یہ ظلم روا رکھا گیا۔ معصوم انسانوں کی ہلاکت اور قومی وسائل کی تباہی، جس کے ہاتھوں بھی ہوئی، قابلِ مذمت ہے۔ لیکن انتقام در انتقام مسئلے کا حل نہیں، بلکہ بگاڑ کا راستہ ہے۔ اس لیے لفظی نزاکتوں اور عملی کوتاہیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے، ملک کے

وسیع تر مفاد میں مسئلے کے سیاسی حل کی تلاش ہی اس عذاب سے نکلنے کا راستہ ہے۔ دنیا میں ایسے معاملات کا فوجی حل نہ کبھی پہلے ہوا ہے اور نہ آج ہو سکتا ہے۔ امریکہ خود افغانستان میں طالبان سے مذاکرات کی راہیں تلاش کر رہا ہے اور اب تو ان کے اپنے مقرر کردہ افغان صدر حامد کرزئی تک نے بھی کہہ دیا ہے کہ: ''امریکہ طالبان سے مذاکرات کرے اور پاکستان اس کی معاونت کرے، اس کے بغیر افغانستان میں امن نہیں آسکتا''۔ برسرِ جنگ عناصر ہی کے درمیان مذاکرات سے امن کی راہیں نکلتی ہیں۔ اس سلسلے میں سطحی جذباتیت حالات کو بگاڑ تو سکتی ہے، اصلاح کی طرف نہیں لا سکتی۔

- دہشت گردی کی دوسری بڑی شکل فرقہ واریت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ نائن الیون سے بہت پہلے سے موجود ہے اور بدقسمتی سے اس میں مقامی عناصر کے ساتھ بیرونی ہاتھ بلکہ حکومتیں بھی ملوث رہی ہیں۔ الحمدللہ، عوامی سطح پر کوئی نفرت اور تصادم نہیں ہے، لیکن مخصوص عناصر بڑے ہولناک انداز میں یہ آگ بھڑکانے اور معصوم انسانوں کو نشانہ بنانے کا گھناؤنا خونیں کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہاں بھی مذاکرات، افہام و تفہیم، تعلیم و تلقین کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک مجرمانہ سرگرمی ہے، جس پر آہنی ہاتھوں سے قابو پانا ضروری ہے۔ تمام مذہبی فرقوں کے معتبر اور مقتدر افراد کو مل کر اس فتنے کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں اور معلومات فراہم کرنے والی مددگار ایجنسیوں کو اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ نیز جو بھی بیرونی قوتیں ملوث ہیں ان پر مؤثر گرفت اور تادیبی کارروائی ہونی چاہیے۔
- دہشت گردی کی تیسری شکل کا تعلق ان قوتوں سے ہے، جو علیحدگی پسندی کے ایجنڈے کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ محض قوت کے استعمال سے ان رجحانات کا مقابلہ ممکن نہیں ہے۔ جہاں

بھی مذاکرات اور سیاسی حل کی ضرورت ہے، وہاں حقیقی مشکلات اور محرومیوں کو دُور کیا جانا چاہیے۔ یہ محرومیاں محض معاشی ہی نہیں، سیاسی بھی ہیں اور خصوصیت سے سیاسی عمل میں صحیح مقام نہ ملنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کا سیاسی حل ضروری ہے۔ البتہ جو بھی قانون اپنے ہاتھ میں لے یا معصوم انسانوں پر ظلم کرے اور ان کے جان و مال پر حملہ کرے، اس کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ کارروائی ردِ جارحیت (Deterrence) کی نوعیت کی ہونی چاہیے اور جرم پر قانون کے مطابق گرفت کی شکل میں بھی۔

- سیاسی میدان میں دہشت گردی کی ایک اور قبیح شکل وہ ہے، جو چند سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگ کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے اس بدترین منظرنامے کا اصل گہوارا کراچی ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے تاریخی فیصلے میں نام لے کر بتادیا ہے کہ کون کس کس شکل میں یہ گھناؤنا کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ دستورِ پاکستان کی واضح خلاف ورزی ہے اور محض سیاسی مفاہمت کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ اسے برداشت کیا گیا ہے، بلکہ فروغ دیا گیا ہے اور فروغ دیا جارہا ہے۔ آج بھی روزانہ اعلان ہوتا ہے کہ اتنے ٹارگٹ کلر پکڑے گئے ہیں، جن کا ایک سیاسی جماعت سے تعلق ہے، لیکن نہ اس جماعت کا نام لیا جاتا ہے اور نہ اس کے خلاف دستور اور قانون کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں مذاکرات نہیں قانون کے مطابق کارروائی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے زیادہ منافقت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔
- دہشت گردی کا پانچواں میدان وہ ہے، جس کی کوئی سیاسی بنیاد نہیں ہے، بلکہ وہ کھلے کھلے جرم کی قبیل میں آتی ہے۔ لینڈ مافیا، بھتہ مافیا، ڈرگ مافیا، اغوا برائے تاوان، گلی محلے کے جرائم وغیرہ، یہ سب اسی زمرے میں آتے ہیں اور ان کا مقابلہ بھی قانون کی آہنی گرفت سے کیا جانا چاہیے۔ اس نوعیت کی دہشت گردی

کے لیے فوجی آپریشن کی ضرورت نہیں۔ یہ پولیس کی ذمہ داری ہے، اور پولیس مؤثر انداز میں اس کا سدباب کر سکتی ہے، بشرطیکہ پولیس کو سیاست بازی سے پاک رکھا جائے، اسے ضروری وسائل فراہم کیے جائیں۔ مناسب تربیت ہو اور وہ دستور اور قانون کے مطابق آزادانہ طور پر اپنے فرائض انجام دے سکے۔ پولیس کو سیاسی دباؤ کی آلائشوں سے پاک کر کے اس میں پیشہ ورانہ کمال پیدا کرنے کو اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ضرورت ہو تو وقتی طور پر دوسرے قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی دستور کے تحت مدد لی جاسکتی ہے، لیکن مستقل حل پولیس کی اصلاح، تربیت، وسائل کی فراہمی اور نگرانی کا مؤثر انتظام ہے۔

یہاں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ان جرائم کی قوتِ محرکہ اور مددگار عامل دراصل اس غیر قانونی اسلحے کی فراوانی ہے، جس نے پورے ملک کو لاقانونیت اور دھونس کی آگ میں دھکیل رکھا ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ گذشتہ ۱۲ برسوں کے دوران اس خودکار اور آتشیں اسلحے کو ضبط کرنے کے بیانات تو ضرور نظر نواز ہوتے رہے ہیں، مگر اس سمت میں ایک قدم بھی بامعنی طور پر نہیں اُٹھایا جاسکا۔ اور یہ سب شاخسانہ ہے، سیاسی پشت پناہی اور فیصلوں پر عمل کرنے سے راہِ فرار اختیار کرنے کا۔ اس لیے حکومت اور انتظامیہ کو اس عفریت پر قابو پانا چاہیے ورنہ یہ تمام دعوے اور اقدامات خواب و خیال ہی رہیں گے۔

۴۔ فوجی آپریشن کے بارے میں ہم بہت صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فوج ملک کی سرحدوں کے دفاع کے لیے ہے۔ ملک میں امن و امان کا قیام بنیادی طور پر پولیس کی ذمہ داری ہے، اور اس فرق کو سختی سے ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ فوج کی تربیت ایک خاص انداز میں ہوتی ہے اور اسے امن و امان کے قیام کے کاموں میں اُلجھانا اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو متاثر کرتا ہے اور سول نظام کے ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا

ہے۔ غیر معمولی حالات میں وقتی طور پر دستور میں فوج کے استعمال کی گنجائش موجود ہے، لیکن وہ مخصوص حالات تک محدود ہے اور اسے معمول بنا دینا پورے نظام کو تباہ کرنے کا باعث ہو سکتا ہے۔

پھر پاکستان کی تاریخ میں فوجی حکمرانی کے جو تلخ تجربات رہے ہیں، اس کی روشنی میں تو یہ ہرگز قرین حکمت نہیں کہ فوج کو ان معاملات میں اُلجھایا جائے۔ فاٹا اور سوات میں جو کام فوج کو سونپا گیا، وہ اس غلط حکمت عملی کا حصہ تھا، جس پر مشرف دور سے عمل ہو رہا ہے۔ سوات میں فوج پانچ سال سے موجود ہے اور اب تک سول نظام وہاں ذمہ داری اُٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہے، حالانکہ یہ کام زیادہ سے زیادہ ایک دو سال ہی میں ہو جانا چاہیے تھا۔ شمالی علاقہ جات کا معاملہ اس سے بھی نازک ہے۔ وہاں کی اپنی تاریخ اور روایات ہیں۔ ان کو نظر انداز کر کے جو انتظام قائم کیا گیا ہے، وہ چلنے والا نہیں ہے۔ بندوق اور ایف۔۱۶ کی بم باری سے امن قائم نہیں ہو سکتا اور نہ کلاشنکوف یا خود کش بمباری سے شریعت کا نفاذ ہو سکتا ہے۔

ہم صاف الفاظ میں متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ان علاقوں میں فوج کا اقتدار قائم ہوتا ہے تو اسے کوئی چیز دوام سے نہ روک سکے گی۔ الجزائر اور مصر کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ جب فوج کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا یا اسے یہ کردار ادا کرنے دیا جائے گا تو پھر اقتدار پر اسے بُراجمان ہونے سے روکنا ممکن نہیں رہتا۔ ہمیں اس خطرناک کھیل سے مکمل طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔

ان علاقوں میں امن اس وقت قائم ہو سکتا ہے اور قائم رہ سکتا ہے، جب ہم اس پالیسی کو بحال کریں جو قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں اختیار کی تھی اور جس کی بدولت ۵۰ برس تک کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ ہاں، جو غلطی ہم نے کی، وہ یہ تھی کہ اس کے تقاضوں کو پورا نہ کیا اور سیاسی ارتقا کا جو عمل ۱۹۴۸ء کے بعد شروع ہو جانا چاہیے تھا، وہ دستور سازی کے باوجود شروع نہ ہوا کہ ہماری قیادتوں نے دستور کے عمل

دخل سے پورے شمالی علاقہ جات کو باہر قرار دے دیا۔ انگریز کے سامراجی دور کے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کے ذریعے وہاں حکمرانی ہوتی رہی اور وہاں کے روایتی نظام کو جو ملک، جرگہ اور پولیٹکل ایجنٹ پر مشتمل تھا، باقی ملک کے نظام سے مربوط نہ کیا گیا۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ بلا تاخیر شمالی علاقہ جات کو اس کے تاریخی نظام اور روایات کی روشنی میں باقی ملک کے نظام سے پیوست کیا جائے۔ پاکستان کے دستور اور عدالتی نظام کا وہاں پورا پورا اطلاق ہو۔

اس علاقے کو وہاں کے لوگوں کے مشورے سے یا صوبہ خیبر پختونخوا میں شامل کیا جائے، جیسا کہ FATA کے سلسلے میں کیا جاچکا ہے، یا پھر ان کو ایک صوبے کی حیثیت دی جائے اور وہ پاکستان کی تعمیر وترقی میں اپنا پورا کردار ادا کر سکیں۔ جو مضحکہ خیز صورت اس وقت پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ میں تو وہ نمائندگی رکھتے ہیں، مگر اسمبلی اور سینیٹ کو ان کے علاقے کے بارے میں کوئی اختیار نہیں، یہ دورنگی ختم ہونا چاہیے۔ اس بنیادی تبدیلی کے نتیجے میں بہت سی وہ خباثتیں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی، جو خرابی کا باعث ہیں اور سیاسی، معاشی، سماجی اور تعلیمی ترقی کا وہ عمل بھی مؤثر ہو سکے گا، جو اس وقت ٹھٹھرا ہوا ہے۔

قبائلی علاقہ جات کے مستقبل کا انحصار اس بنیادی تبدیلی پر ہے۔ آگاہ رہنا چاہیے کہ فوجی آپریشن حالات کو بگاڑ تو سکتا ہے مگر اصلاح کی راہیں استوار نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہم حکومت پاکستان کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ ملک اور فوج دونوں کو کسی نئی تباہی سے دوچار کرنے سے مکمل طور پر احتراز کرے اور اصلاحِ احوال کے لیے وہ راستہ اختیار کرے، جو عوام کی خواہشات کے مطابق ہو اور جو قائداعظم کے وژن اور ان کے دکھائے ہوئے راستے کا تسلسل ہو۔

(عالمی ترجمان القرآن، فروری ۲۰۱۴ء)

ضمیمہ: فہرست عنوانات ”دہشت گردی کے خلاف جنگ، پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات“

جلد اوّل

- پیش لفظ V
- تعارف VII

حصہ اول: خارجہ پالیسی کے تقاضے اور عمل درآمد

- خارجہ پالیسی کی تشکیل اور اس کے عنوانات ۰۳
- ۹/۱۱ کے بعد امریکہ کے ساتھ تعاون کی پالیسی ۱۷
- امریکی صدر بش کا دورہ پاکستان اور دوطرفہ تعلقات ۳۷
- گوانتاناموبے میں قرآن کی بے حرمتی اور پاک امریکہ تعلقات ۵۱
- پاکستان کا ایٹمی پروگرام، امریکی دباؤ اور اثرات ۶۹
- ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور پاکستان کی ایٹمی صلاحیت ۸۳
- ایٹمی پروگرام کی بحث عالمی تناظر میں ۹۷
- سفارت کاری کے آداب، امریکی رویہ اور ہمارا طرز عمل ۱۰۱
- غیر سفارتی اور غیر قانونی امریکی اقدامات پر ردعمل ۱۲۱

حصہ دوم: امریکہ کی عالمی پالیسیاں اور ان پر ردِ عمل

- عراق پر حملہ - امریکی عزائم اور جرائم ۱۳۹
- عراق پر امریکی حملہ کے مضمرات ۱۴۹
- توہین رسالتؐ پر مبنی خاکوں کی اشاعت اور احتجاج ۱۶۵
- دوسری اسرائیل۔ حزب اللہ جنگ ۱۷۱
- ضمیمہ: ’دہشت گردی کے خلاف جنگ: پاک امریکہ تعاون اور اس کے اثرات‘ جلد دوم کی فہرست عنوانات ۱۸۲
- اشاریہ ۱۸۳

اشاریہ

آ

آثار قدیمہ,۴۷
آخری فوجی آپریشن,۸۸
آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل,۱۰۰
آزاد ریاست کے مفادات,۱۶۳
آزاد عدالتی کمیشن,۸۶,۸۷
آسٹریلیا(Australia),۹
آکسفورڈ(Oxford)یونیورسٹی,۷۷
آل پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ,۵۲
آیت اللہ سیستانی,۱۳۸
آئرش ریپبلکن آرمی,۵۰,۹۴,۱۰۸
آئی ایس آئی,۲۶
آئی ایس پی آر,۱۰,۱۱,۱۶
آئین ۱۹۷۳,۳۲,۱۰۱
آئینی ترمیم ۱۲ویں,۱۴۹/۱۸ویں,۱۵۲

ا

ابو غریب(جیل),۱۲۱
اداروں کا عدم استحکام,۵۸
اژدہائی قانون,۱۵۵
اسامہ بن لادن,۲۵,۲۷,۳۰,۴۴
اسپیشل سروسز,۹۶
اسپیکر(قومی اسمبلی),۱۰۲/سیکرٹری قومی اسمبلی,۲۰
استعماری گرفت,VI
استعماری نظام کے شکنجے,V
اسٹیٹ پالیسی,۱۷۴
اسٹیفن بڈل(Stephen Biddle)،پروفیسر,۱۹۳
اسرائیل,۱۹,۹۶,۱۲۰,۱۶۶,۱۹۱
اسرائیل کی جدید ترین آرمی,۱۹
اسکاؤٹس,۹۶
اسلام,۳۸,۳۹,۷۱,۷۲,۷۳,۷۴,۷۵,۷۷,۷۹,۸۰,
۸۶,۸۸,۹۰,۱۰۴,۱۰۵,۱۱۸,۱۴۹,۱۵۵,۱۹۷
اسلام آباد,۷۱,۷۴,۷۵,۸۰,۸۸,۹۰,۱۹۷
اسلام آباد ہائی وے,۷۵
اسلام کا جنگجویانہ اظہار,۷۹
اسلامی معاشرہ,۱۵۵
اعتدال پسندی,۳۹
اعلیٰ اختیاراتی بورڈ,۱۱۹
اعلیٰ سطحی عدالتی کمیشن,۱۳
اغواء برائے تاوان,۷۶,۱۹۹
افغان پالیسی,۸,۱۴
افغان حکمران,۱۵
افغان حکومت,۱۳,۱۹۲
افغان مسئلے کا افغان حل,۱۶۹
افغانستان,۳,۷,۸,۱۰,۱۴,۱۷,۲۳,۲۸,۲۹,۴۲,۴۳,
۴۴,۴۶,۵۹,۱۰۰,۱۰۴,۱۰۵,۱۲۰,۱۴۵,۱۶۵,
۱۶۷,۱۶۸,۱۶۹,۱۷۶,۱۷۹,۱۸۱,۱۸۵,۱۸۶,۱۸۷,
۱۸۸,۱۹۰,۱۹۱,۱۹۳,۱۹۷
افغانستان اینلسٹ نیٹ ورک Afghanistan)
(Analyst Network کابل,۱۸۶
افغانستان پر امریکی قبضہ,۱۰۰
افغانستان پر فوج کشی,۱۹۷
افغانستان سے امریکی افواج کا مکمل انخلا,۱۶۸

افغانستان کی جنگ,۱۶۵,۱۶۸,۱۷۹,۱۸۵/ جنگ کا خاتمہ,
۱۹۳
افغانستان کی سرحد,۱۷
افیون کی تجارت,۱۸۶
علامہ اقبال,۱۲۶
اقوام متحدہ,۱۹,۱۳۷,۱۴۱,۱۴۴,۱۷۱,۱۷۲,۱۷۵,۱۷۸
اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی,۱۷۳
اقوام متحدہ کا چارٹر,۱۹,۱۷۱,۱۷۲
الحجرٰت(سورۃ),۱۲۸
اٰل عمرٰن(سورۃ),۱۲۳
الانبیاء(سورۃ),۱۲۳
الجزائر,۲۰۱
الجزیرہ,۱۶۶,۱۷۷
الخدمت فاؤنڈیشن,۹۸
القاعدہ,۸,۸۱,۸۲,۱۱۳
اللہ کی کتاب,۱۷
الہامی ہدایت,VI
امام مالکؒ,۱۲۵
امام ابو حنیفہؒ,۱۲۵
امام احمد بن حنبلؒ,۱۲۵
امام بارگاہ,۱۱۵,۱۸۹
امام حسینؓ,۱۳۹
امام شافعیؒ,۱۲۵
امام مہدی رضی اللہ عنہم,۱۱۸
امت مسلمہ,۶۷,۸۴,۸۹,۱۰۴
امریکہ کا دستور,۱۷۲
امریکہ کی اعلانیہ پالیسی, ۲۸/ امریکہ کی ایئر فورس,
۱۲۲/امریکہ کی پارلیمنٹ, ۱۷۹/امریکہ کی
دہشت گردی,۸, ۱۳۳/امریکہ کی دو عملی, ۹۴/
امریکہ کی زیر قیادت بین الاقوامی سیکورٹی فورسز,
۱۸/ امریکہ کی عالمی بالادستی, ۸۰/ امریکہ کے
پالیسی ساز,۱۷,۱۱۹/ امریکہ کے سفیر,۳/امریکہ
کے شراکت دار,۴۶/ امریکہ کے ناکام ترین صدر,
۵۱
امریکی تابعداری کی پالیسی,۷۹
امریکی جنگ میں پاکستان کی شراکت,VIII
امریکی حکومت,VII, VIII
امریکی اخبارات, ۱۰۴/امریکی استعمار, ۱۷۱, ۱۹۷/
امریکی افواج, ۳۵, ۱۲۱, ۱۶۶, ۱۶۸, ۱۷۶, ۱۸۷/
امریکی افواج کا انخلا, ۱۷۶/ امریکی انتظامیہ,
۱۵۰/امریکی بحری جہاز USS Cole, ۴۱/
امریکی تحقیقی ادارے کی رپورٹ, ۱۷۳/امریکی
تھنک ٹینک, ۱۲۰/امریکی جارحیت, ۱۶۷/امریکی
جنگ,۷۹,۱۶۳,۱۶۴,۱۸۱,۱۹۲,۱۹۶/امریکی جنگ
باز قیادت, ۱۹۲/امریکی جنگی کاروائیاں, ۲۰/
امریکی حکومت,۴۳,۱۱۹,۱۷۳,۱۷۴/امریکی خفیہ
ایجنسیاں, ۱۵۱, ۱۹۵/ امریکی ڈرونز, ۱۳۳, ۱۳۴/
امریکی ریاست اوکلاہاما, ۴۱/ امریکی سپریم کورٹ,
۸۱/امریکی سفارت خانے,۱۷۷/ امریکی سولجرز,
۲۹/امریکی سی آئی اے, ۱۷۲/امریکی فورسز,
۸۳/امریکی کانگرس,۱۷۲/امریکی مقتدرہ,۱۶۵/
امریکی منصوبہ ساز,۲۲
امریکی دباؤ,۱۸۷,۱۹۲
امن وامان کی عمومی صورت حال,۷۰
انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبیون (International
Herald Tribune),۸۱
انتخابات(۲۰۰۸ء),۱۹۶
انٹیلی جنس, ۲۶, ۲۹, ۳۰, ۶۲, ۱۰۸, ۱۳۸, ۱۳۹/ انٹیلی
جنس اداروں کی کارکردگی, ۳۰/انٹیلی جنس
ادارے,۲۶/ انٹیلی جنس کا نظام,۶۲
اندرون ملک دہشت گردی,۳۵
انسانی حقوق, ۵, ۷۴, ۱۰۶, ۱۴۱, ۱۴۴, ۱۵۱, ۱۵۹, ۱۶۰,

۱۶۱,۱۷۲,۱۷۴,۱۷۵,۱۷۸
انسانیت کا ارتقا,V
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز,VI,X
انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز,۱۱
انسداد دہشت گردی قانون,۱۴۹
انسداد دہشت گردی کی عدالتیں,۱۴۹
انگریز,۱۲۹,۲۰۲
انگلستان,۴۸,۷۹,۹۴,۱۰۸
انگور اڈہ,۱۶
اہلِ تشیع,۱۱۶
اہلِ سنت,۱۱۶
اوباما، بارک(Barack Obama),۹۴,۱۹۰,۱۷۷
رنگ زیب,۱۰۶
اوقاف,۷۴
اوکاڑہ کے فارم,۷۴
اے این پی,۵۳,۱۵۵
ایبٹ آباد,۲۵,۲۶,۲۹,۳۳,۱۳۵
ایران,۲۲,۱۶۹,۱۷۹
ایساف کی فورسز,۱۳۶
ایشلے اسمتھ(Ashley Smith),۱۲۰,۱۲۱
ایکسپریس ٹریبیون(The Express Tribune),
۱۵۶
ایم ایم اے(متحدہ مجلس عمل),۶۴
ایم کیو ایم,۵۳,۱۱۰,۱۵۵
ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ,۱۷۸
اینٹی ٹیررزم ایکٹ,۱۴۷
اینٹی منی لانڈرنگ بل ۲۰۱۰,۱۴۲

ب

باجوڑ,۷,۸,۱۴,۱۵,۱۶,۳۵,۹۴,۱۱۲,۱۹۷
بادشاہی مسجد,۷۱,۹۰
بحرین,۱۲۰
بدکاری کے اڈے,۷۶
بدمست سوپر پاور,۱۸۷
برطانوی استعمار, ۹۰/ برطانوی پاسپورٹ, ۱۰۳/
برطانوی دور,۴۶,۷۰/ برطانوی شہری,۱۰۶
برازیل(Brazil),۵
برطانوی اور امریکی خفیہ ادارے,۱۰۶
برطانوی حکومت پر الزام,۱۰۶
برطانیہ,۴۹,۱۰۶,۱۱۳,۱۷۸,۱۷۹,۱۸۵,۱۸۶,۱۹۴
برکلے سینٹر,۸۱
بروکلین,۱۰۴
بش، جارج ڈبلیو(George W. Bush)امریکی صدر,
۹, ۱۳, ۲۷, ۴۲, ۴۵, ۴۸, ۵۰, ۵۱, ۷۲, ۸۲, ۱۱۰,
۱۲۱,۱۲۲,۱۳۲,۱۳۳,۱۵۰,۱۸۷,۱۹۱
بش انتظامیہ, ۸۲, ۱۲۱/بش کی پالیسی, ۷۲/بش کے
مطالبات,۱۳۲
بغداد,۱۳۸
بلوچستان,۹,۳۲,۳۵,۴۷,۵۶,۹۹,۱۰۱,۱۲۷,۱۲۹,۱۳۰,
۱۳۱, ۱۹۰/ بلوچستان کا مسئلہ,۱۲۷,۱۲۹/ بلوچستان
کی گیس, ۱۳۰/بلوچستان میں تزویراتی ریلوے,
۱۲۹
بنیادی حقوق کا تحفظ,۱۴۸,۱۵۷
بھارت, ۱۷, ۳۱, ۴۴, ۱۶۶, ۱۶۹, ۱۹۵/ ہندوستان, ۱۷/
ہندو,۱۷
بھتہ خوری,۱۴۸,۱۹۹
بی بی سی,۹,۲۱,۷۱,۸۴,۸۹,۱۳۳,۱۶۶
بے روزگاری,۱۹
بے نظیر بھٹو,۴۹,۱۰۷,۱۰۹
بیٹی کا تقدس,۷۱
بیرونی استعمار,۱۲۱
بیرونی امداد اور قرضوں پر انحصار,۱۸۲

بیرونی قوتوں کا کردار,۵۹
بین الاقوامی انسانی قانون, ۱۷۱, ۱۷۲/ بین الاقوامی تحقیقات,۱۰۹/ بین الاقوامی ضابطوں, ۱۱۳/ بین الاقوامی قانون, VIII, ۸۰, ۸۲, ۸۳, ۱۷۱, ۱۷۲, ۱۷۴,۱۷۵,۱۷۸,۱۹۲/ بین الاقوامی قانون بسلسلہ انسانی حقوق,۱۷۴/ بین الاقوامی میڈیا,۱۳۴/ بین الاقوامی وارزون,۱۷۲
بینکنگ قوانین,۱۴۲

پ

پارلیمنٹ کی قومی سلامتی کی کمیٹی, ۵۳/ پارلیمانی کمیٹی برائے قومی سلامتی,۱۸۱,۱۹۶
پارلیمنٹ کی اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی,۱۳
پارلیمنٹ کی توہین,۵۳
پارلیمنٹ کی قرارداد,۹۲
پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن,۹۸
پاک امریکہ تعاون, VI, IX
پاکستان پر حملے, ۴۲/ پاکستان کی سیکورٹی,۹۳/ پاکستان کا مفاد,۱۶۹/ پاکستان کی خود مختاری,۳۰/ پاکستان کی آزاد حدود,۱۶,۲۱/ پاکستان کی آزادی,۱۶۳,۱۶۷, ۱۷۸/ پاکستان کے خلاف ایک جنگی اقدام,۳۰/ پاکستان کے خلاف جنگ,۲۲,۱۵۰
پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل, IX
پاکستان کی خود مختاری,۵,۲۷,۳۳,۳۴,۱۰۱/ پاکستان کی زمینی اور فضائی حدود, ۱۸۹/ پاکستان کی سالمیت, ۱۰۰/ پاکستان کی سیاست, X/ پاکستان کے قبائلی علاقے,۱۸۹/ پاکستان مخالف پالیسی,۴۶
پاکستان کی نظریاتی اساس, VI
پاکستان مسلم لیگ(ق),۳۳
پاکستان میں امریکی جنگی کارروائی,۲۰
پاکستانی افواج,۴۶,۱۸۹
پاکستانی تاریخ کا تاریک ترین سانحہ,۷۰
پاکستانی حدود,۳,۴
پاکستانی سیکورٹی ایجنسی,۱۰۳
پاکستانی فوج,۴,۱۲,۱۹,۳۵,۹۷
پاکستانی فوجی آفیسرز,۴۷
پاکستانی مدارس,۷۷
پاکستانی ہیلی کاپٹر,۹
پختون خوا,۱۱۲
پرافل بدوائی(Praful Bidwai),۱۷
پشاور,۲۱,۱۳۵,۱۷۸
پشاور ہائی کورٹ کے فیصلے,۱۷۸
پشتون,۱۴,۴۴,۹۸,۱۲۸/ پشتون نسلی اکثریت,۱۴
پنٹاگان(Pentagon),۸۲
پنجاب رجمنٹ,۷
پولیٹکل ایجنٹس,۱۳۲
پولیس اسٹیٹ, ۱۵۱/ پولیس اسٹیشن, ۷۵/ پولیس کی چوکیاں,۱۸۹/ پولیس مقابلے,۱۵۸
پی ٹی کی تربیت,۱۱
پیٹرک کک برن(Patrick Cockburn) صحافی کاؤنٹر پنچ,۱۸۶
پیپلز پارٹی,۱۸,۵۳,۱۰۹,۱۳۳,۱۵۵
پیپلز پارٹی کی قیادت,۱۰۹
پیو(Pew),۱۹۴,۱۹۵

ت

تاریخ اسلام,۶۵
تاریخی عمارات,۷۴
تامل ٹائیگرز,۹۷
تحریکِ انصاف,۱۵۶,۱۷۰,۱۷۹
تحریکِ طالبان پاکستان,۱۸۹
تحصیل دتاخیل,۴

تحفظ پاکستان آرڈیننس,۱۴۴,۱۴۷,۱۵۰,۱۵۲
تحفظ پاکستان ایکٹ,۱۴۱,۱۵۴,۱۵۶
تحقیقاتی کمیشن,۱۱۵
تخریب کاری,۱۲,۱۳۲
تشدد پسندی,۱۰۰/ تشدد کے متاثرین,۳۲
تعزیر,۷۳,۸۳
تھامس رٹنگ(Thomas Ritting),۱۸۶
توہین رسالتؐ,۱۱۸

ٹ

ٹائمز(The Times)اخبار,۷۵
ٹارگٹ کلر,۱۹۹/ ٹارگٹ کلنگ,۵۳,۱۴۸
ٹاسک فورس,۹۹
ٹریڈ سنٹر,۴۱
ٹموتھی میک ویچ(Timothy McVeigh),۴۱
ٹونی بلیئر(Tony Blair)برطانیہ کا وزیر اعظم,۱۰۶

ج

جاپان(Japan),۱۱۰
جارج واشنگٹن یونی ورسٹی,۱۹۳
جامعہ حفصہ,۶۹,۷۰,۷۲,۷۳,۷۴,۷۶,۷۷,۷۹,۸۲,
۸۳,۸۴,۸۷,۱۹۷
جان ایسپوزیٹو(John Esposito)پروفیسر,۳۹
جان کیری(John Kerry),۱۹۰
جان ومال کا تحفظ,۱۴۸/ جان ومال کا عدم تحفظ,۷۰
جبری گمشدگی,۵۶,۷۶
جدوجہدِ آزادی,۴۴
جرگہ,۴,۳۲,۹۶,۹۸,۱۰۱,۱۶۶,۲۰۲/ لویہ جرگہ,۱۶۶
جرم اور سزا میں تناسب,۸۳
جرمنی,۱۷۸
جلیانوالہ باغ,۷۱
جماعت اسلامی,۵۳,۹۸,۱۱۲,۱۱۳,۱۵۶,۱۷۰,۱۷۹
جماعت اسلامی پاکستان,۱۱۲
جمائما فاؤنڈیشن,۱۷۸
جمعہ کے خطبات,۱۱۹
جمعیت علماء اسلام,۹۲,۱۵۵
جمہوریت,۵,۶۴,۱۲۲,۱۲۸,۱۴۹
جنرل پرویز مشرف,VII,۹,۱۰,۱۱,۱۸,۲۱,۲۷,۲۸,۲۹,
۳۲,۳۶,۳۸,۴۴,۴۵,۴۸,۴۹,۵۱,۶۱,۶۲,۹۳,
۱۰۶,۱۰۷,۱۱۰,۱۸۷,۱۸۸,۲۰۱
جنرل جاوید اشرف قاضی,۱۳۰
جنرل ڈائیر(Gen. Dyer),۷۱,۹۰
جنرل علی محمد جان اورکزئی,۹
جنرل گل حسن,۵۷
جنگی تناظر,۱۵۰
جنگی انصاف,۳۸/ جنگی جرائم,۱۷۲
جنوبی افریقہ,۴۸,۹۴
جنوبی امریکہ,۱۷۹
جنوبی ایشیائی معاملات,۱۳۴
جنیوا کنونشن,۱۱۳
جہاد فی سبیل اللہ,۲۰,۷۱
جوڈیشل ریویو,۱۵۸
جوموکینیاٹا(Jomo Kenyatta),۹۴
جیمز کننگھم(James Cunningham)امریکی
سفیر,۱۶۶

چ

چین,۲۲,۴۴,۱۷۱,۱۸۵,۱۸۸

ح

حامد کرزئی,۱۶۶,۱۹۸
حزب اللہ,۱۹
حضرتِ آدم علیہ السلام,V
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ,۶۵
حضرت اشرف علی تھانوی (مولانا),۱۲۵
حضرت عمر فاروقؓ,۶۵
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی,۸۰
حضور پاک ﷺ,V,۶۵,۱۱۸
حفظ قرآن,۱۱
حقوقِ انسانی کمیشن,۱۵۶
حقوقِ انسانی کی عالمی تنظیمیں,۱۵۵
حکمرانی کا جواز,۳۳
حکمرانی کی پابندی,۱۰۱
حکومتِ افغانستان کا کنٹرول,۱۸۶
حکومت اور عوام میں بڑھتے فاصلے,۴۸
حکومت کی رٹ,۹۶,۹۳,۱۴۶,۱۸۲
حنبلی,۱۲۵
حنفی,۱۲۵

خ

خالد رحمٰنVI,X
خارجہ امور کی کمیٹی,۷۲
خارجہ پالیسی,۱,۶,۷,۳۲,۴۹,۵۱,۹۳,۱۰۶,۱۱۰,۱۱۲,
۱۶۳,۱۸۰,۱۹۶
خانہ جنگی,۱۲۲,۱۶۹,۱۸۷
خصوصی وفاقی عدالتوں کا قیام,۱۴۹
خلائی مخلوق,۱۵۷
خلفاے راشدین,۶۵,۱۱۸
خنزیر کا گوشت,۱۲۵
خود کش حملہ آور,۱۰۷,۱۱۰
خود مختاری کی پامالی,۵,۱۰
خود انحصاری کے اہداف,۱۸۳
خود ساختہ جلاوطنی,۱۰۷
خود کش بمبار,۱۲,۸۵,۱۱۰,۱۹۷
خود کش حملہ,۷
خود کشی,۱۸۵
خیبر,۹۷,۱۳۵,۱۳۶
خیبر ایجنسی,۱۳۵,۱۳۶
خیبر پختون خوا,۱۶۴

د

درگئی,۷,۱۵
دستور پاکستان,۱۷۲
دستور پاکستان کی واضح خلاف ورزی,۱۹۹
دستور کا تقدس,۶۴/ دستور کی حدود,۱۶۱
دفاعی سسٹم,۲۹
دہشت گردی کی جڑ,۶۳
دہشت گردی کی امریکی جنگ,۱۶۳/ دہشت گردی کی
جنگ, ۳۹, ۹۳, ۱۳۳, ۱۸۱/ دہشت گردی کے
خلاف جنگ,VI, ۱, ۲۲, ۳۲, ۳۵, ۵۲, ۸۰, ۸۵,
۱۰۰,۱۱۲,۱۴۵,۱۶۷,۱۷۰,۱۸۰,۱۸۷,۱۹۳,۱۹۴,
۱۹۷/ دہشتگردی کے خلاف جنگ میں تعاون,
IX/ دہشت گردی کی پانچ بڑی شکلیں,۱۹۷/
دہشت گردی کے واقعات,۳۵,۳۶,۴۵,۵۹,۱۱۲,
۱۴۷
دولتِ عثمانیہ,۱۲۰
دی گارجین (The Guardian) اخبار,۲۶,۱۰۶,
۱۷۷,
دی نیوز (The News) اخبار,۱۷
دی ہندو (The Hindu) اخبار,۱۷

دینی مدارس,۷۷,۷۸,۱۶۴,۱۸۹
دینیات,۱۱

ڈ

ڈان(Dawn)،اخبار,۷۵,۸۸,۱۳۲,۱۵۶,۱۷۵
ڈرگ مافیا,۵۵,۱۹۹
ڈرون حملے,۳۰,۹۴,۱۶۳,۱۳۲,۱۳۵,۱۶۳,۱۶۵,۱۶۷,
۱۷۱,۱۷۲,۱۷۴,۱۷۵,۱۷۶,۱۷۷,۱۷۹,۱۸۱
ڈرون کی تباہ کاریوں,۱۷۸
ڈمہ ڈولا,۸
ڈیوڈ سوان سن(David Swanson)
امریکی دانش ور,۱۶۵

ذ

ذرائع ابلاغ کی لامحدود آزادی,۷۷

ر

رابن رائٹ(Robin Wright),۱۲۰
راولپنڈی,۱۰۸,۱۱۶
رچرڈ باؤچر(Richard Boucher),۱۳۴
ردِ جارحیت(Deterrence),۱۹۶,۱۹۹
رنجیت سنگھ,۷۱,۹۰
روس,۲۲
ری پبلکن گارڈز,۵
ریاست کا استحکام,۱۵۲/ریاست کی رٹ کا قیام,۱۸۲
ریاستی دہشت گردی,۵۲,۱۱۲
ریاستی نظام کی ناکامی,۷۷
ریاستی نگرانی,۱۵۱
رینجرز,۸۸,۱۴۸
رینڈ کارپوریشن(RAND Corporation),۱۲۲

ز

زبانی احتجاج,۱۸
زرداری، آصف علی(صدر),۳۰,۴۹
زلزلہ(۲۰۰۵ء),۹۷
زمبابوے,۴۸
زمین پر قبضہ اور تجاوزات کا مسئلہ,۷۳/زمینوں پر قبضہ,
۴۴,۷۵,۷۶
زہریلی گیس,۸۶
زیر حراست اموات,۷۶

س

سامراج کی پٹاری,۱۲۱
سانحۂ راولپنڈی,۱۱۵
سب ڈویژنل پولیس آفیسرز,۷۵
سپریم کورٹ,۵۶,۵۸,۸۶,۸۷,۸۸,۸۹,۱۶۰,۱۷۶,
۱۷۸,۱۹۹
سرحد,۱۸,۳۶,۱۳۰
سرکاری املاک,۱۸۹
سرنگیں,۸۵
سری لنکا(Sri Lanka),۹۶,۱۱۰
سعودی عرب(Saudi Arabia),۴۹,۱۲۲
سعودی عرب کی شیعہ آبادی,۱۲۲
سفارتی آداب,VIII
سفید فاسفورس,۸۶,۸۸
سکھوں,۷۱
سماجی حقیقت پسند,۴۵
سندھ,۷۵,۹۸,۱۳۰/سندھی,۱۲۸
سنوڈین(Snowden),۱۵۱,۱۷۷
سُنّی,۱۲۰,۱۲۱,۱۲۲/سُنّی مزاحمت,۱۲۱
سوات,۳۵,۹۱,۹۲,۹۴,۹۷,۹۹,۱۵۶,۲۰۱

سوات کے IDPs,99
سوپر پاور,179,187
سولجر بازار,57
سی ڈی اے,75
سیاسی جماعتوں کے عسکری ونگ,199
سی آئی اے,59,177
سینیٹ آف پاکستان,20,56
سینیٹ کی انسانی حقوق کمیٹی,47
سینیٹر ایس ایم ظفر,47
سینیٹر انجینئر ملک رشید احمد خان,135
سینیٹر پروفیسر خورشید احمد VII, VIII, IX,56,137,
141
سینیٹر ثناء اللہ بلوچ,129
سینیٹر رحمٰن ملک,50,144
سینیٹر رضا ربانی,20,31
سینیٹر مشاہد حسین,27
سینیٹر گل نصیب، مولانا,35
سینیٹر لوگر (Lugar),59

ش

شافعی,125
شام,120,179
شام پر فوج کشی,179
شجاعت حسین، چوہدری (وزیر اعظم),131
شراب,26,125
شرق اوسط,187
شکئی,94
شمالی اتحاد,44
شمالی علاقہ جات,201,202
شمالی وزیرستان,156
شورش زدہ علاقوں,101
شیعہ,120,121,122,137,138
شیعہ سنی فرقہ بندی,138
شیعہ رہنما مقتدا الصدر,121

ص

صاحبزادہ ہارون الرشید (سابق ایم این اے),112
صدر کی سیکورٹی کی ذمہ داری,62
صدر مشرف پر حملہ,61
صلاح الدین امین,106
صوبائی خود مختاری,100
صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا),9,101,112,179,202

ط

طاغوتی طاقتیں,V
طالبان,14,16,18,47,93,95,151,167,176,181,
186,189,193,194,195,196,198
طالبان دشمنی,151
طالبان سے مذاکرات کا مقصد,167

ع

عاشورہ,137,139
عافیہ صدیقی (ڈاکٹر),103,104,105
عام انتخابات,VIII
عالمگیر بالادستی,165
عالمی ترجمان القرآن,202
عالمی رائے عامہ,VIII,164,191,192
عالمی سامراج,7
عائشہ صدیقہ (ڈاکٹر),47
عبادت گاہیں,115
عبدالرشید غازی,77,78

عدالتی انتظامیہ,۹۶
عدالتی نظام,۴۱,۵۸,۲۰۲
عدل کا سقوط,۸۴
عراق,۵,۱۳,۲۲,۴۲,۴۳,۱۲۰,۱۲۱,۱۲۲,۱۳۹,۱۶۵,
۱۷۹,۱۸۵,۱۸۷,۱۹۳
عراق پر حملہ,۴۲/ عراق کی جنگ,۱۹۳
عراق میں شیعہ سُنّی تصادم,۱۲۱
عرب دنیا,۱۲۰
عرب ممالک,۶,۱۲۰
عزت کا عدم تحفظ,۷۰
عسکریت پر مبنی حکمت عملی,۱۳
عسکریت پسند گروہ,۱۴۵
عظمت ازواجِ مطہرات,۱۱۸
عظمت اہلِ بیت اطہار,۱۱۸
عظمت صحابہ کرام,۱۱۸
علی صالح کا بلا المری,۸۱
علما کے ۲۲ نکات,۱۱۸
عوامی نیشنل پارٹی,۹۲,۹۴
عیدالاضحیٰ,۱۶۹

غ

غارت گر,۱۶
غربت,۱۹
غیر پشتون اور پشتون کی کشمکش,۴۴
غیر عرب,۱۲۲

ف

فارن افیئرز (Foreign Affairs)جریدہ,۱۷, ۴۳,
۱۹۳
فحش فلمیں,۷۶
فرانس,۲۷,۴۱,۴۶,۶۵
فردوس عاشق اعوان (ڈاکٹر),۲۸
فرقہ وارانہ کشیدگی,۱۱۶/ فرقہ واریت کی جنگ,۱۱۵
فرقہ وارانہ ہم آہنگی,۱۱۷
فرنٹیئر کانسٹیبلری,۱۴۸
فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن,۲۰۲
فرنٹیئر کور,۱۸,۱۴۸
فضائیہ,۲۹
فقیر محمد,۱۲
فلوجہ (Falluja),۱۲۱
فوجداری عدل,۱۷۲
فوج کی سیاست میں مداخلت,۱۳۱/ فوج کی اتھارٹی,۱۸/
فوج کے استعمال کا جواز,۸۳/ فوج کے بارے میں
تصورات,۴۷/ فوج کی تشکیل,۱۳۱/ فوج کے لیے
مشکلات,۴۷/ فوج کے مورال پر اثرات,۴۷
فوجی آپریشن,۸۸,۹۵,۹۶,۱۹۴,۲۰۰,۲۰۲
فوجی آپریشن کی ناکامی,۹۵
فوجی ایکشن میں قرآن پاک شہید,۸۴
فوجی ٹریننگ,۱۱/ فوجی چھاؤنیاں,۱۳۱,۱۸۹/ فوجی طاقت
کا استعمال,۱۳۱
فیڈرل جج,۱۰۴

ق

قانون کے احترام کا فقدان,۵۶
قانون کے اندر جواب دہی,۱۴۸
قانونی استحقاق (legal legitimacy),۱۸۲
قائداعظم (محمد علی جناح),۴۶,۵۷,۵۹,۷۵,۷۸,۲۰۱,
۲۰۲
قائداعظم یونیورسٹی,۷۸
قبائلی علاقے,۳۵,۴۷,۷۷,۷۹,۱۰۱,۲۰۲/ فاٹا,۳۵,
۴۶, ۵۶, ۱۶۳, ۱۸۲, ۱۹۴, ۲۰۱, ۲۰۲/ قبائلی

علاقوں میں حملوں,۷۹/ قبائلی عمائدین,۹۶
قبضہ گروپ,۷۴
قتل وغارت گری,۱۱۸,۱۳۲
قدامت پسندانہ اقدار,۷۹
قرآن وسنت,V
قرآن پاک شہید,۷۱/ قرآن پاک کی بے حرمتی,۸۶
قرآن کی تعلیم,۱۱
قوت کے استعمال کی دھمکی,۹۳
قوم پرست تحریک,۱۴
قومی پالیسی کا اعلان,۱۷۴
قومی خود مختاری پر اثرات,۴۵
قومی سلامتی پر پارلیمانی کمیٹی, ۳۱, ۵۳, ۹۲, ۱۱۱, ۱۸۱, ۱۹۶/ قومی سلامتی کی اسٹریٹیجی,۱۰۰/ قومی سلامتی کی پالیسی,۱۸۹/ قومی سلامتی کی حکمت عملی, ۳۲/ قومی سلامتی کی نئی پالیسی,۱۸۳
قومی شاہراہ کی متبادل لائن کی تعمیر,۱۲۹
قیدیوں پر تشدد,۱۲۱

ک

کابل,۲,۷۲,۸۵,۱۰۳,۱۶۶,۱۸۶
کابل جرگے,۲,۷۲,۸۵
کال راستیالا(Kal Raustiala),۸۱
کالا قانون,۱۵۶,۱۶۱
کاؤس جی(Cowasjee),۷۵
کاؤنٹر پنچ,۱۲۰,۱۶۵,۱۸۶
کیپیٹل پولیس,۷۵
کربلا,۷۱,۷۶,۱۳۸/ کربلا صغریٰ,۷۱
کرفیو,۱۳۲
کراچی, ۵۳, ۵۴, ۵۶, ۵۷, ۷۵, ۹۷, ۹۸, ۱۰۴, ۱۰۷, ۱۰۸, ۱۹۰, ۱۹۹/ کراچی کا مسئلہ, ۵۳/ کراچی کی صورت حال,۵۳/ کراچی میں فسادات,۵۷
کرد,۱۲۱
کرسٹ آف ہینز رپورٹ (Christof Heyns Report),۱۷۵
کرفیو,۵۷,۱۱۵,۱۳۳
کروز میزائل,۸,۲۸
کشمیر میں جاری مزاحمت,۴۴
کفن,۸۹
کل جماعتی کانفرنس کی ۹ ستمبر ۲۰۱۳ء کی قرارداد,۱۸۱
کلاشنکوف,۸۵
کلے مین شو(Clemenceau),۶۵
کمانڈ سینٹرز,۸۲
کمانڈر ویزلے کے کلارک(Wesley K. Clark), ۸۱
کھیلوں کی تربیت,۱۱
کولیشن سپورٹ فنڈ,۱۶۷
کوئٹہ,۱۳۷,۱۳۸
کیلے فورنیا(California)یونیورسٹی لاس اینجلز,۸۱
کیمرون منٹر (Cameron Munter) امریکی سفیر, ۵۹
کیمیائی اسلحہ,۸۹
کینیا,۴۸,۹۴
کیوبا,۱۷۹

گ

گڈ فرائیڈے ایگریمنٹ,۵۰
گھروں پر حملے,۷۶,۱۲۱
گوادر پورٹ, ۱۲۹, ۱۳۰/ گوادر پورٹ کی ترقی کا مسئلہ, ۱۲۹
گوانتاناموبے(Guantanamo Bay),۵
گورڈن براؤن(Gordon Brown)برطانوی وزیر اعظم,۸۵

گورکن,۸۹
گورنرہاؤس,۵۳
گیلپ,۳۹,۴۰,۱۹۱,۱۹۴,۱۹۵

ل

لاپتہ افراد,۱۶۰/لاپتہ افراد کا مسئلہ,۵۶,۷۷,۷۹
لال مسجد,۶۹,۷۱,۷۳,۸۴,۱۹۷
لاہور,۷۰,۷۴,۱۵۸
لبرل انتہا پرستی,۷۲/لبرل دانش ور,۱۲۰/لبرل لیفٹ
لابیز,۱۶۶
لبنان,۱۹,۱۰۹
لندن,۱۹۳
لندن ٹائمز,۱۷
لوہار امنڈی,۴
لیاقت باغ راولپنڈی,۱۰۷
لیڈر آف دی ہاؤس,۲۷,۹۱,۱۲۷
لیگل فریم ورک آرڈر(LFO),۶۵
لینڈ مافیا,۱۹۹

م

ماڈل ٹاؤن لاہور,۱۵۸
مالکی,۱۲۵
مالیاتی آمریت,۱۴۳/مالیاتی دہشت گردی,۱۴۳
ماہی گیری,۱۳۰
ماورائے عدالت قتل,۱۷۲
مائیکل بوئیل(Michael Boyle),۱۷۷
متحدہ عرب امارات,۴۹
متوازی نظام عدل,۱۴۱,۱۴۹
مچھیروں کی بستی,۱۳۰
محرم الحرام,۱۱۵/محرم کا تہوار,۱۰۸
مدرسے,۹,۱۰,۱۱,۱۶,۷۱,۷۳,۷۷,۷۸,۸۴,۸۸,۸۹,
۱۱۰,۱۱۵,۱۱۶,۱۱۷,۱۹۷
مذہبی انتہا پسندی,۷۲,۱۳۸,۱۳۹
مساج پارلر,۷۶
مسجد,۱۰,۱۶,۶۹,۷۰,۷۱,۷۲,۷۳,۷۴,۷۷,۸۲,۸۳,
۸۴,۸۵,۸۷,۸۸,۸۹,۹۰,۱۱۵,۱۱۶,۱۱۹,۱۳۳,
۱۸۹,۱۹۵,۱۹۷
مسجد کی بے حرمتی,۸۴,۸۹
مسعودہ بانو(ڈاکٹر),۷۷,۸۵
مسلح امریکی فوجی,۱۰۳
مسلم دنیا,۱۱۹,۱۲۰,۱۲۲/مسلم دنیا میں امریکی جنگ,
۱۲۲
مسلم لیگ(ن),۱۵۲
مسلم ممالک,۱۲۰
مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا,۱۲۵
مشرق وسطی کا ایک نیا نقشہ,۱۲۰
مشرقی سرحدوں سے تجارت,۱۰۲
مشرقی محاذ,۱۴
مصر,۲۰۱
مظفر آباد,۴۴
مغرب کی تاریخ,۳۹
مغربی استعمار,۱۲۰/مغربی دنیا,۶۵,۱۵۱/مغربی ذرائع
ابلاغ,۲۱,۸۵
مغربی محاذ,۱۴
مفتی محمد رفیع عثمانی,۱۲۴
مقدسات کی توہین,۸۴
مکاتیب فکر,۱۱۷,۱۱۹
مُلّا عبدالسلام ضعیف,۱۸۸
مُلّا عمر,۴۴,۱۶۹
مالاکنڈ,۹۹
ملی یکجہتی کونسل,۱۱۷,۱۳۷,۱۱۷/ملّی یکجہتی کونسل کا طے

کردہ ضابطۂ اخلاق,۱۱۷
منشیات کی اسمگلنگ کی روک تھام,۱۴۱,۱۸۶
منی لانڈرنگ,۱۴۱,۱۴۲,۱۴۳
مہاجرت,۹۵
مہدی فوج,۱۲۱
موت کی سزا,۱۱۸
مؤثر بہ ماضی,۱۶۰
فضل الرحمٰن (مولانا),۱۱۱
مودودیؒ (ابوالاعلیٰ، مولانا),۱۷۱
میڈم ریڈلی (Madam Ridley) برطانوی خاتون صحافی,۱۰۵
میران شاہ,۱۳۲,۱۳۳,۱۶۳
میلسی روتھوین,(Malisi Ruthven) ۱۹۳

ن

ناروے,۱۷
ناگزیر ریاست,۱۷۹
نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ,۸۵
ناموس کی توہین,۸۴/ناموس رسالت,۸۴
نائن الیون (۹/۱۱),۵,۸,۲۸,۳۶,۳۸,۳۹,۴۱,۴۳,۴۵,۸۲,۱۱۰,۱۱۱,۱۴۳,۱۸۵,۱۹۱,۱۹۲,۱۹۸
نائن الیون، ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات,VII
نائن الیون کے بعد مسلم دنیا,۱۲۲
نسل کشی,۱۳,۱۷۳,۱۷۴
نظام عدل,۹۴,۹۹,۱۴۱,۱۴۶
نواز شریف (میاں محمد),۱۴۶,۱۵۵,۱۴۹
نیٹو,۱۳,۱۴,۲۱,۲۳,۲۸,۳۶,۴۶,۸۱,۸۲,۱۰۶,۱۶۴,۱۶۶,۱۶۷,۱۶۹,۱۷۹,۱۸۵,۱۹۲
نیٹو افواج,۱۴,۲۱,۳۶,۴۶,۱۶۴,۱۶۷,۱۶۹,۱۸۵,۱۹۲
نیٹو کی سپلائی,۱۷۹
نیر روزن (Nir Rosen),۱۲۱
نیشنل ایمرجنسی سیٹ اپ,۹۹
نیک محمد,۹۴
نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela),۹۴
نیم فوجی ادارے,۷۵,۱۵۸
نیوکلیئر اثاثے,۲۹,۴۴
نیوکلیئر پاور,۱۷۹
نیویارک ٹائمز,۹,۸۵,۱۲۰,۱۷۷
نیویارک ریویو آف بکس,۱۹۲
نیویارک کی Human Rights Watch,۱۳۵

و

وادی تیرہ خیبر ایجنسی,۱۳۵
وارنٹ کے بغیر گرفتاری,۱۶۰
واشنگٹن,۱۳,۳۰,۳۱,۱۲۱,۱۷۵,۱۹۳
واشنگٹن پوسٹ,۳۰
وانا,۴
وحی,V
وزیر اطلاعات,۲۷,۱۳۷
وزیر اعلیٰ,۵۷,۷۵
وزیر دفاع,۲۲
وزیر مذہبی امور,۷۴
وزیر مملکت برائے خارجہ,۱۰۴
وزیر اعظم,۲۲
وسائل کی منصفانہ تقسیم,۱۰۱
وسط ایشیا,۴۴,۲۲,۱۷۶
وکی لیکس,۱۵۱
ولی نصر,۱۸۰
ونسٹن چرچل (Winston Churchill) برطانوی وزیر اعظم,۶۶
ویت نام,۹۶,۱۶۵

ہ

ہجرت,۹۶
ہزارہ کمیونٹی,۱۳۷
ہسپتال پر حملہ,۱۳۳
ہلمند,۱۸۶
ہمارا سیکورٹی کا نظام,۶۲
ہنری کسنجر(Henry Kissinger),۱۲۰
ہنگو,۱۶۴
ہیلری کلنٹن(Hillary Clinton) امریکی وزیر
خارجہ,۹۵
ہیلی کاپٹر,۱۶,۱۸,۲۹,۳۶,۴۷,۱۳۲
ہیومن رائٹس واچ,۱۵۶

ی

یمن,۸۲
یورپ,۶,۲۳,۹۶,۱۱۰,۱۹۳
یورپین پارلیمنٹ,۱۷۱
یونان,۱۱۰